ستمبر ۲۰۲۴ء

BIHAR URDU ACADEMY

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

بلغ العلیٰ بکمالہ کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ صلوا علیہ وآلہ

غزل

وہ ظاہر بیں نگاہوں میں جدا معلوم ہوتا ہے
مگر ہر رنگ میں جلوہ نما معلوم ہوتا ہے
چمن ہستی کا خاروں سے نہیں خالی جدھر دیکھو
مگر ظاہر میں کیسا خوش نما معلوم ہوتا ہے
نہ توڑا آج تک اس کو کسی عہد سلاطیں نے
بڑا محکم یہ آئین قضا معلوم ہوتا ہے
ترے کوچے کے رہ رو مرمٹے گو مدتیں گزریں
مگر اب تک نشانِ نقش پا معلوم ہوتا ہے
مقدر کے نوشتہ کو کہاں آنکھیں کہ میں پڑھ لوں
مگر اتنا کہوں گا، کچھ لکھا معلوم ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے
فنا کو بیچ سے کر دو الگ، پھر کچھ نہیں رہتا
وہی از ابتدا تا انتہا معلوم ہوتا ہے
فنا ہم نفس امارہ کو اپنے کر چلے امدؔاد
ہمیں ہر دور اب دورِ بقا معلوم ہوتا ہے

امدؔاد عظیم آبادی

امدؔاد عظیم آبادی کا اصل نام میر عنایت حسین ہے۔ ان کے والد حاجی میر فرحت حسین شرفائے عظیم آباد میں محسوب ہوتے تھے اور خاندانی نجابت کے ساتھ ساتھ اپنی علم دوستی سے بھی ممتاز تھے۔ چند ابتدائی کتابوں کی تدریس کے حوالے سے اُن کا نام شاؔد کے اساتذہ میں بھی شامل ہے۔ امدؔاد کے دادا سید محمد ہادی اپنے وقت کے طبیب حاذق تھے اور کلکتہ میں طبابت کرتے تھے۔ امدؔاد عظیم آبادی کی ولادت ۲۲ جون ۱۸۷۲ء کو اپنے آبائی مکان واقع لال املی پٹنہ سیٹی میں ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی جو فارسی میں منشی ٹوڈل مل جیسے یگانہ روزگار استاد کے شاگرد تھے، پھر انہوں نے حضرت شاؔد کی شاگردی کا بھی شرف پایا۔ امدؔاد کی وفات یکم ستمبر ۱۹۴۴ء کو ہوئی اور اپنے آبائی مکان کے امام باڑے میں دفن ہوئے ''نورتن'' کے مصنف صبؔا عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ وہ شاؔد کی وفات کے وقت اُن کے سب سے کہنہ مشق اور معمر شاگرد تھے، اسی لئے جب ''انجمن تلامیذالرحمٰن'' (بزم شاؔد) کا قیام ہوا، تو حضرت امدؔاد اس کے صدر بنائے گئے اور تاحیات اس منصب پر فائز رہے۔

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر

ابراراحمد خان

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۵ شمارہ : ۹

ستمبر ۲۰۲۴ء

زرتعاون : پندرہ روپے

سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

email : zabanoadabbua@gmail.com

buapat2014@gmail.com

Web : www.biharurduacademy.in

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	ابراراحمد خان	۳
ذکرِ رسول	ذکررسول اورقدیم دکنی شاعری	محمد شوکت جمال	۴
	شعرائے بہار کی رباعیوں میں ذکررسالت مآب	محمد پرویز اختر	۷
مقالات	قمرنقوی نقشبندی بحیثیت ناول نگار	رئیس الدین رئیس	۱۰
	صحیح اردو کیسے بولیں؟	ڈاکٹراسلم جاوداں	۱۵
	احسان سیوانی: یادیں اور باتیں	ڈاکٹرارشاداحمد	۱۷
	جانشین داغ نسیم ہلسوی عظیم آبادی	سلطان آزاد	۲۱
	سودااوران کا فارسی کلام	ظفرامام	۲۵
	فراغ روہوی کی غزل گوئی	عظیم انصاری	۳۰
	مولانا مسعود عالم ندوی کی اردوانشاپردازی	طلحہ نعمت ندوی	۳۴
	شاعررومان: اختر شیرانی	زیباراشد	۳۷
	الیاس احمد گدی اوران کا ناول فائرایریا......	شاہد حسین	۴۱
افسانے	عدل	صادق چوبک / ڈاکٹرمہتاب جہاں	۴۳
	سکھ	ارشدمنیم	۴۵
	دھوکے باز	منظرعالم	۴۸
منظومات	نوائے رنگ	وشال کُھلّر	۵۱
	بجائے اس کے	نریندرناتھ چکرورتی / نسیم عزیزی	۵۲
	ایٹمی آنکھیں / غزل	فریدہ انجم / فراق جلال پوری	۵۳
	غزلیں	شاہداختر	۵۴
	غزلیں	بے نام گیلانی / ڈاکٹرقدسیہ انجم علیگ	۵۵
	غزلیں	مظہرمجاہدی	۵۶
	غزلیں	ہنررسول پوری	۵۷
	غزلیں	کلیم سہسرامی	۵۸
	غزلیں	غیاث احمد شہودی / مظہرزاہدی	۵۹
	غزلیں	شکیل ہاشمی	۶۰
	غزلیں	احمداسلم	۶۱
کتابوں کی دنیا	سفرہے شرط — سرورغزالی	مبصر: ڈاکٹرشاہد جمیل	۶۲
	الفاظ کا جزیرہ — تسلیم انجم	مبصر: شکیل سہسرامی	۶۴
	سپنوں کا شیش محل — ساحل سہسرامی	مبصر: اشفاق عادل	۶۶
سلام و پیام	ایم۔احمد توصیف، محمد زبیراحمد، نوازش خرم، ڈاکٹرایس جبیں، شکیل سہسرامی، محمد کاشف احمد مصطفیٰ ندیم خان غوری، ایم۔عالم محفوظ		۶۷

بچوں کا زبان وادب ۷۳ —— ۸۰

’’زبان وادب‘‘ میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آراسے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرف آغاز

ربیع الاول کا مہینہ سایہ فگن ہے اور بفضل ربی اس مناسبت سے ’’ذکر رسول‘‘ کے ساتھ زیر نظر شمارے کی مشمولاتی ابتدا کا شرف حاصل ہو رہا ہے، جس کے تحت ایک طرف ’’ذکر رسول اور قدیم دکنی شاعری‘‘ کے زیر عنوان حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے لے کر ولی و سراج تک متعدد شعرا کے نمونہ کلام کی روشنی میں بعض علمی و لسانی خصوصیات اور اعتقادی تحفظات کی طرف اشارے ہوئے ہیں اور موضوعات و مضامین کی بندش اور اسلوب بیان کے متنوع زاویے مبرہن کئے گئے ہیں اور دوسری طرف ضروری معلوماتی تمہید سے بہ طرز گریز، اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے راسخ و جوشش سے لے کر عہد امروزہ تک ’’شعرائے بہار کی رباعیوں میں ذکر رسالت مآب‘‘ کے گونا گوں پہلو دکھائے گئے ہیں۔

بعد ازیں ’’مقالات‘‘ کے تحت قمر نقوی نقشبندی کی شخصیت و سوانح کا تذکرہ اور ان کی ناول نگاری کا اختصاص دکھایا گیا ہے اور ’’صحیح اردو کیسے بولیں؟‘‘ کا عنوان قائم کر کے صحت تلفظ کی اہمیت بتاتے ہوئے اندراجِ اعراب کے ساتھ صحیح اور غلط تلفظ کی برجستہ نشاندہی کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں اس حصہ میں کہیں ذاتی روابط کا ذکر کرتے ہوئے، احسان سیوانی کی یادیں اور باتیں آئی ہیں اور ان کے شاعرانہ خصائص ثبت قرطاس ہوئے ہیں اور کہیں جانشین داغ حضرت نسیم بلسوی عظیم آبادی کی مختصر سوانح کے ساتھ نفس موضوع کے خاص پہلو پر مدلل انداز سے گفتگو ہوئی ہے تو کہیں علمی و تحقیقی محنت کے ساتھ ’’سودا اور ان کا فارسی کلام‘‘ موضوع تحریر بنا ہے اور ’’فراغ روہوی کی غزل گوئی‘‘ کے اوصاف اور ’’مولانا مسعود عالم ندوی کی اُردو انشا پردازی‘‘ کے خصائص پر تجزیاتی نظر ڈالی گئی ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ اس حصہ میں علمی آداب کے ساتھ ’’شاعر رومان: اختر شیرانی‘‘ کا موضوع بھی بحسن تمام مبرہن کیا گیا ہے اور الیاس احمد گدی کے ناول ’’فائر ایریا‘‘ کا انفراد بھی زیر مطالعہ آیا ہے۔

اس شمارے میں ’’افسانے‘‘ کا آغاز مترجمہ کہانی ’’عدل‘‘ سے ہوا ہے جو بظاہر کیچڑ میں پڑے ہوئے اُس زخمی گھوڑے کی کہانی ہے جو بس ٹک ٹک دیکھ رہا ہے، لیکن درحقیقت اس کہانی کی ماحولیاتی بنت اور اس کے مکالمے و مناظر میں بالواسطہ طور سے ہمہ جہت ذہنی و عملی انصاف کا ایک بڑا پیغام چھپا ہے۔

بعد ازیں اس حصہ کی کہانیاں ’’سکھ‘‘ اور ’’دھوکے باز‘‘ اگرچہ بظاہر رومانی و جنسی اور نفسیاتی کہانیاں ہیں، مگر ان میں ’’سکھ‘‘ کی پونم اور ’’دھوکے باز‘‘ کی صبا کے فیصلے کا فرق اور اس کے اندرونی محرکات صاف صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ’’سکھ‘‘ میں سجن اور ’’دھوکے باز‘‘ میں طارق اور اس کے دوست قاسم کا کردار بھی مرد کی نفسیات کے ایک نہیں، انیک پہلو آئینہ کر دیتا ہے۔

ہمیں پوری امید ہے کہ انشاء اللہ، اس شمارے کے مذکورہ نثری تحائف کے ساتھ ساتھ نظموں اور غزلوں سے مرصع ’’منظومات‘‘ کے اوراق بھی دل پسند ٹھہریں گے، ’’کتابوں کی دنیا‘‘ بھی جالب التفات ہوگی اور ’’بچوں کا زبان و ادب‘‘ بھی ہمارے نونہالوں کو پسند آئے گا۔

انہیں سطروں کے ساتھ آپ کے تاثرات کا انتظار رکھتے ہوئے خدا حافظ، خدا ناصر!

(ابرار احمد خان)

ذکرِ رسول

محمد شوکت جمال
Sabzibagh, Patna - 800004

ذکر رسول اور قدیم دکنی شاعری

ذکر رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک عالمی موضوع ہے بلکہ یوں کہیں تو مبالغہ نہیں کہ یہ ارضی وسماوی اور کائناتی موضوع ہے۔آپ سارے عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے اور بیشک سارا عالم آپ کے نام نامی کی تسبیح پڑھ رہا ہے۔ذکر نبی کے لئے نہ تو زبان کی قید ہے، نہ ملک وقوم، علاقے، تقریر اور تحریر کی، بس شرط ہے تو یہ ہے کہ شریعت کی قدریں سلامت رہیں اور عقیدے وعقیدت کی حد فاصل ٹوٹنے نہ پائے۔

شاعری کی دنیا میں اصطلاحی طور پر جسے ''نعت نبی'' کہتے ہیں وہ ذکر نبی کا ہی ایک خاص طریقہ ہے جو شریعت کے ساتھ ساتھ بہرصورت شعریت کی پاسداری بھی چاہتا ہے اور یہ اردو زبان کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کے ارباب سخن نے تاریخ کے اُس دور اولین سے ہی جسے قدیم دکنی دور کہتے ہیں، یہ سعادت سمیٹ رکھی ہے۔

محققین اور مورخین ادب بتاتے ہیں کہ اردو کی سب سے پہلی نعت جس شاعر کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر آئی، وہ بہمنی دور کے صوفی بزرگ حضرت سید محمد حسینی ہیں جنہیں عام طور پر خواجہ بندہ نواز گیسودراز کہا جاتا ہے۔اُن کا تخلص شہبازؔ تھا اور انہوں نے نعت شریف میں اپنے تخلص کا استعمال بھی فرمایا ہے اور رسول مکرم کی مدحت کے مضامین باندھتے ہوئے جہاں لولاک لما خلقت الافلاک کی تلمیح لایا ہے اوراحد واحمد میں میم کے پردے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہیں آپ کی رحمت وبخشش کا ذکر بھی فرمایا ہے۔

اے محمد جلو جم جم جلوہ تیرا
ذات تجلی ہوئے گی سیں سپورہ تیرا
لولاک لما خلقت الافلاک خالق پا لائے
فاضل افضل جتے مرسل ساجد سجود ہو آئے
امت رحمت بخشش، ہدایت تشریف لا پائے
مخفی ناؤں معشوق رکہ ظاہر شہبازؔ کلائے
عشق کے جتی چندر بن اپنی آپ دکھائے
الآن کما کان پھر آپسیں آپ سمائے

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شعرائے دکن کی زبان میں یک گونہ قدامت بھی ہے اور نہ صرف لفظیات بلکہ لسانی تشکیلات کے لحاظ سے بھی یہ شمالی ہند کی اردو سے بہت مختلف ہے۔مزید یہ کہ دکنیات میں ہندوستانی اور علاقائی عناصر کی شمولیت اور اظہار اعتقادیہ پر اس کے فکری و ماحولیاتی اثرات بھی معلوم ومعروف ہیں، اس لئے وہاں کی تقدیسی شاعری میں ذکر رسول کے حوالے سے بعض شرعی گرفت کا بادی النظر میں امکان، یکسر بعید نہیں، لیکن اس کے باوجود بحیثیت مجموعی اس میں دورائے نہیں ہوسکتی کہ قدیم دکنی شاعری میں بصورت نعت ذکر رسول کا سرمایہ بہرحال اپنی خاص انفرادیت رکھتا ہے۔

قدیم شعرائے دکن کے کلام میں ''لولاك الخ'' کے حوالے سے رسول پاک کا ذکر اپنے اپنے انداز میں غواصیؔ، معظّمؔ قادری، میران ہاشمیؔ، ابن نشاطی اور سراجؔ نے بھی کیا ہے مثلاً؂

رتن خاص دریائے لولاک کا
جھلک لامکاں نور افلاک کا
(غواصیؔ)

لولاک کا ترے سر چھتر دیا ہے حق نے
سالار سروراں کا سردار یا محمد
(معظمؔ)

اوّل کر محمد کوں پروردگار
بزاں سب خدائی کیا آشکار
اوّل نور ذاتی کوں پیدا کیا
بزاں سب پو عالم ہویدا کیا

نبیاں کا تو دادا ہے آدم صفی
کہ روحاں کا دادا ہے خاتم نبی

(میراںؔ ہاشمی)

اگر ہوتا نہ توں آدم نہ ہوتا
نہ آدم بلکہ یو عالم نہ ہوتا

(ابن نشاطی)

کہ جس واسطے خلق پیدا کیا
زمیں آسمان سب ہویدا کیا

(سراجؔ)

اسی طرح ''احداوراحمد'' کے حوالے سے نہ صرف حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے یہاں یہ شعر ملتا ہے ۔

واحد آپیں آپ تھا ، آپیں آپ نجھایا
پرگٹ جلوہ کار نے الف میم ہو آیا
عشقوں جلوہ دینے کر کاف نون بسایا

بلکہ نصرتیؔ کے یہاں بھی یہ شعر مشہود ہے ۔

احد ہور احمد میں جگ کوں عظیم
معما ہوئی گرچہ میانی کی میم

رسول پاک کا ذکر نظم کرتے ہوئے شعرائے دکن کے یہاں واقعہ معراج، معجزۂ شق القمر اور دیگر معجزات کی طرف بھی بار بار اشارے ہوتے رہے ہیں مثلاً ۔

محمد نبی ناؤں تیرا اہے عرش کے اُپر پاؤں تیرا اہے

(وجہیؔ)

کئی معجزے دیا اور شق القمر کیا تو
ہے ذات کا ترے پر آثار یا محمد

(معظمؔ)

محمد توں نبی ہے آج برحق قمر کوں یک اشارت میں کیا شق

(ابن نشاطی)

دنیا میں بندوں کی ہدایت کے لئے ایک لاکھ سے زیادہ انبیائے کرام آئے ،اس روایت کو بھی شعرائے دکن نے ذکر رسول کا حصہ بنایا ہے اور

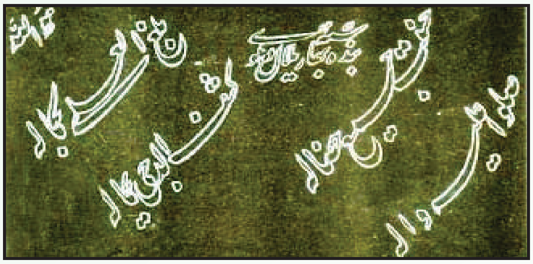

عکس وصلی ماخوذ بہ شکریہ "صحیفہ خوشنویساں" مولوی احترام الدین احمد شاغلؔ عثمانی شائع کردہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی،۱۹۸۷ء

آپ کو افضل الانبیا اور خاتم الانبیا کے مرتبے والا بتایا ہے ۔

اسی ہور ایک لاکھ پیغمبر آئے
ولی مرتبہ کوئی تیرا نہ پائے

(وجہیؔ)

یک لک اسی پیغمبراں اُبجے جگت میانے والے
تج پر نبوت ہے ختم سب تھے توں ہی پیارا ہوا

(قطب شاہ)

رسول عرب ہور عجم آج او
رسولاں کے سب سیس کا تاج او

(غواصیؔ)

نبی مکرم کا ذکر کرتے ہوئے قلی قطب شاہ اور بحریؔ نے استعانت نبی کا مضمون بھی باندھا ہے ۔

جو کوئی ان کی محبت سوں غلام کے کوایا ہے
مدد اس مصطفیٰ ہے ہور رہے گا وہ صدا (سدا) رافع

(قطب شاہ)

محمد گر مدد ہوگا ہمارا سکل دُکھ درد رد ہوگا ہمارا

(بحریؔ)

بحریؔ کا مذکورہ بالا شعر نہ صرف غیر منقوط ہے بلکہ یہ شعر جس نعت پاک میں آیا ہے وہ پوری نعت ہی صنعت مہملہ میں ہے۔قدمائے دکن نے ذکر رسول کے تعلق سے مولود نبی اور نور نبی وعلم نبی کی باتیں بھی پڑھنے والوں اور سننے والوں تک پہنچانے کی سعادت پائی ہے اور ساتھ ہی ساتھ حدیث مصطفیٰ،شہر مصطفیٰ اور اس کی تعلیم وزیارت کی اہمیت و آرزو بھی ان کے نوک قلم پر آگئی ہے ۔

لکھ فیض سوں پھر آیا، دن دین محمد کا
آفاق صفا پایا، دن دین محمد کا
یو عید ہمن ساجے نصرت کے بجے باجے
ہے جگ کے نبی راجے، دن دین محمد کا

(محمد عبداللہ قطب شاہ)

عجب آفرینش کی دریا کا دُر — کہ جس نور سے بحرِ ہستی ہے پر
حبیب احد تو نچ اے مصطفیٰ — ترا نانوں لے تیچ ہو دل صفا

(نصرتیؔ)

عدم میں تھے عالم کوں پرورد گار
اسی کے کیا نور سوں آشکار
ازل محض اس کا خزینہ دسے
ابد عین اس کا مدینہ دسے

(غواصیؔ)

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا
محمد کی گلی بھیتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا
نظر ہے علم منطق ہور معانی میں فراقیؔ کوں
اگر علم حدیث مصطفیٰ ہوتا تو کیا ہوتا

(سید محمد فراقیؔ)

یا محمد دو جہاں کی عید ہے تج ذات سوں
خلق کوں لازم ہے جی کوں تج پہ قربانی کرے
جس مکاں میں ہے تمہاری فکر روشن جلوہ گر
عقل اوّل آ کے واں اقرار نادانی کرے
کیا ملک، کیا انس و جن، یہ جگ میں ہے کس کو سکت
خط بنا تج مکھ کے جو تفسیر قرآنی کرے

(ولیؔ دکنی)

جہاں تک شفاعت و امامت اور ندائے رسالت کے مضامین کا معاملہ ہے، یہ بھی ذکر نبی کے دوران شعرائے دکن کے یہاں نظم ہوتے رہے ہیں اور ''نعت'' کا لفظ بھی استعمال میں آیا ہے ؎

مقبول تو خدا کا دلدار یا محمد
تو نور گنج مخفی اظہار یا محمد

(مغطمر)

کروں میں لے قلم ابتدا نعت
سچے حق کے پیمبر کا ادا نعت

(ابن نشاطی)

عجب روز محشر کا سردار ہے
صف اصفیا میں وہ سالار ہے

جگت میں اوسے سلطنت ہے مدام
جماعت میں ہے انبیا کی امام

(سراجؔ)

مزید برآں قدیم سخنورانِ دکن نے ایسے اشعار بھی رقم کئے ہیں جن میں توصیفی تراکیب نے بصد سہولت و روانی جگہ پایا ہے۔ مزید تفصیلوں سے بچتے ہوئے آخر میں ایسے ہی چند اشعار کے ساتھ یہ تحریر مختصر کی جاتی ہے ؎

زہے نامور سید المرسلیں — کہ آخر وو ہے شافع المذنبیں
زہے دین و دنیا میں سرمد ہے توں — تو محمود واں یاں محمد ہے توں

(نصرتیؔ)

نبی توں پاک، تیرا پاک دیں ہے — سچا توں رحمۃ اللعالمیں ہے

(ابن نشاطی)

رہ شرع کا ہادی مستقیم — شریعت کے دریا کا در یتیم

(سراجؔ)

(''دکن میں اردو'' نصیر الدین ہاشمی اور نعتیہ مجموعہ ''روشنی ہی روشنی'' مرتبہ وقار خلیل، مطبوعہ حیدرآباد، ۱۹۸۱ء سے اخذ متن میں خصوصی استفادہ کے ساتھ)

محمد پرویز اختر
Damodarpur, Muzaffarpur - 843113

شعرائے بہار کی رباعیوں میں ذکر رسالت مآب

رباعی اردو زبان میں فارسی سے آئی ہے اور یہاں اس کی قدامت وعظمت یقیناً مشہور ومعروف بھی ہے۔ یہ مختصر شعری صنف چونکہ بنیادی طور سے خاص اوزان شاعری اور چار مصرعوں کی پابند ''عروضی صنف'' ہے، اس لئے اس میں موضوع کی کوئی قید نہیں۔ اس صنف میں بلاشبہ موضوعات کا ایک جہاں آباد ہے اور دیگر اوصاف کے شانہ بہ شانہ ہمارے قدیم وجدید شاعروں نے اسے تقدیسی شاعری کے انفس وآفاق سے خوب خوب آشنا بنایا ہے اور اگر ایک طرف خدائے ذوالجلال کی حمد وثنا میں رباعیاں لکھی ہیں اور اولیائے کرام واصفیائے عظام کی منقبت سے اس صنف کو زینت بخشی ہے تو دوسری طرف اس صنف میں ذکر رسالت مآب نظم کرنے کا بھی خوب خوب شرف پایا ہے۔

یہاں چند سطروں کے لئے بات ذرا سا اپنے بنیادی موضوع سے ہٹتی ہے، لیکن اُسے لکھ دینے میں شاید کچھ حرج نہیں کہ صوفی بزرگ میر سید علی غمگینؔ دہلوی اردو رباعیات کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ ان کا زمانہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ وہ دہلی سے گوالیار چلے گئے تھے اور وہیں ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ ان کی رباعیوں کے مجموعہ کا نام ''مکاشفات الاسرار'' ہے جو اٹھارہ سو رباعیوں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ ۱۲۵۵ھ/۱۸۴۰ء میں ترتیب پایا تھا جس کی اشاعت ۲۰۰۸ء میں ہوئی۔ اس میں رسول پاک کا ذکر بہ شکل رباعی اس طرح ملتا ہے ؎

ہوتی ہے خیرہ تجھ پہ نبیوں کی نگاہ
لائق تری نعت کے نہیں غمگینؔ آہ
اس واسطے رات دن یہ رکھا ہے ورد
صلوٰۃ اللہ یا رسول اللہ

یہاں گفتگو رباعیوں کے حوالے سے ہے تو مزید یہ بات بھی لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اردو میں ''توشیحی رباعی'' کا آغاز، ذکر رسالت مآب پر مبنی رباعی سے ہی ہوا ہے۔ یہ رباعی ہمارے دور کے شاعر اسلم حنیف نے لکھی ہے جن کا تعلق سنبھل، اتر پردیش سے ہے ؎

م - محروم تجلیات حق تھا یہ جہاں
ح - حیوان کی صورت میں تھا زندہ انساں
م - مختار جہاں نے تجھے پیدا کرکے
د - دنیا سے مٹا ڈالے ظلمت کے نشاں

اس رباعی کے چاروں مصرع کا پہلا حرف بالترتیب جمع کرنے سے رسول پاک کا نام نامی (محمد) سامنے آجاتا ہے۔ اس نام اقدس پر صد ہا درود وسلام بھیجتے ہوئے اَب براہ راست آتے ہیں اُس عنوان کی طرف جو زیب تحریر ہے۔

تاریخ ادب اردو کا مطالعہ رکھنے والوں سے یہ بات یقیناً چھپی ہوئی نہیں ہے کہ ارض بہار میں بھی اردو وادب وشاعری کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ ملک کے کسی دوسرے خطے اور علاقے میں۔ یہاں کے ارباب سخن نے ابتدائی دور سے ہی مختلف انواع شاعری کے ساتھ اپنی دلچسپی دکھائی ہے اور زمانے کو اپنے کمالات کا معترف بنایا ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ بہار اسکول صدیوں پرانا ہے اور نہ تو ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ اپنی اپنی رباعیوں میں یہاں کے شاعروں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک نظم کرتے ہوئے جو مضامین باندھا ہے، ان کا کامل احاطہ کرسکیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ذکر نبی کا شرف پانے والے جملہ سخنوران بہار کی رباعیاں سامنے رکھ کر اظہار خیال کرسکیں، بلکہ یہاں تو ''گلی از گلزار'' کے مصداق چند رباعیوں کے صرف ہلکے سے تجزیاتی اشاروں کی صورت میں ہی کچھ لکھا جاسکتا ہے۔

بہار کے شعرائے قدیم میں راسخؔ وجوششؔ کا نام بسا معروف

عکس وصلی ماخوذ بہ شکریہ "صحیفہ خوشنویساں" مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی شائع کردہ ترقی اردو بیورو، نئی دھلی، ۱۹۸۷ء

ہے۔ راسخ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عظیم کا ذکر کرتے ہوئے جہاں آپ کو ''درج رسالت'' کا ''در یتیم'' لکھا ہے، وہیں جوشش نے ذکر رسالت مآب کے باب میں مدینہ شریف سے عہد نبوی میں عالمی پیمانے پر اشاعت اسلام اور زمینی فتوحات کی طرف اشارہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ چاند کو دو ٹکڑے کر دینے کا معجزہ بھی ذکر میں لایا ہے ۔

ہے ختم رسل کی شان کیا شانِ عظیم
امت کا نوازندہ ، کریم اور رحیم
گوہر تو بہت درج رسالت میں ہیں
پر منتخب ان میں ہے یہی دُر یتیم

(راسخ)

ہر چند محمد ہے مدینے کا مقیم
بیٹھا ہوا تسخیر کرے ہفت اقلیم
اعجاز کروں اس کا بیاں کیا جوشش
جو اک اشارے میں کرے مہہ کو دو نیم

(جوشش)

بہار کے رباعی گو شاعروں میں حضرت شفق عماد پوری کا نام بھی ملتا ہے۔ ان کا مجموعہ ''خزنیۂ رباعیات'' جیبی سائز پر ۱۹۴۱ء کا اشاعت یافتہ ہے۔ حضرت شفق نے ذکر رسالت مآب کے تعلق سے جہاں ''احد واحمد'' والا مشہور ومتداول موضوع لایا ہے اور عقیدۂ اوتار یہ سے شاید کہ ان کا قلم دور نہیں رہ سکا ہے، وہیں انہوں نے ایک رباعی میں یہ بھی دکھایا ہے کہ لفظ ''محمد'' کی ادائیگی میں واصل الشفتین کا وصف ملتا ہے، پھر ان کے یہاں ''لولاک لما خلقت الافلاک '' کا تلمیحی مضمون بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہاں ذکر رسالت مآب سے مشرف ہوتے ہوئے انہوں نے یہ نکتہ بھی پیش کیا ہے کہ رسول پاک کے نام نامی ''احمد'' اور ''محمد'' دونوں ہی میں حرفوں کی تعداد چار ہے اور گویا انہیں چاروں سے ایمان کے ارکان چہارگانہ قائم ہیں۔

ذرا غور کریں تو یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ از روئے شاعری ذکر نبی کے دوران ان کی رباعیاں ایک سے زیادہ صنائع و بدائع کی تجلیاں بھی دکھاتی رہی ہیں مثلاً پہلی رباعی کا آخری مصرع تحت نقاط ہے، دوسری رباعی میں لفظ ''محمد'' کی ادائیگی کے خاص وصف کا اشارہ ہے، تیسری رباعی تلمیح سے مزین ہے اور چوتھی رباعی میں ''محمد'' اور ''احمد'' کے حروف کی یکساں تعداد سے شاعر نے خاص مضمون پیدا کیا ہے ۔

کثرت میں بھی وحدت کو دیکھا
بحر عرفاں کے جزر و مد کو دیکھا
حد یہ ہے اُٹھا جو میم کا پردہ جو شفق
احمد کے لباس میں احد کو دیکھا

کس منھ سے کہوں مزے عجب دیتے ہیں
جو لطف حلاوت کے ہیں سب دیتے ہیں
آتا ہے زباں پر جب محمد اک بار
دو بار آپس میں لب سے لب ملتے ہیں

اوصاف محمد کے خدا سے پوچھو
تعریف خدا کی مصطفٰی سے پوچھو
پیدا ہوئی یہ ساری خدائی کیوں کر
اس صاحب لولاک لما سے پوچھو

اے صل علٰی حروف از روئے شمار
احمد کے بھی چار ہیں محمد کے بھی چار
چاروں سے ہیں چار رکن ایماں قائم
جن پر ہے قیام دین و ملت کا مدار

اسی طرح فلسفی عظیم آبادی نے رسول اکرم کا ذکر کرتے ہوئے آپ کی روشن تعلیم، آپ کی امت کے مرتبے اور آپ کے نور اقدس کی بدولت

بنی نوع انسان کو میسر آنے والے وصف جمال وکمال کا احساس دلایا ہے اور حسن تعلیل کے وصف سے بھی اپنے کلام کو زینت بخشا ہے۔ یہاں پہلی رباعی کا دوسرا اور چوتھا مصرع تحت نقاط کی شان بھی رکھتا ہے ؎

مسلم کا ذرا رتبہ عالی دیکھو
احمد سا ملا ہے اس کو والی دیکھو
تعلیم محمد سے فلک روشن ہے
اسلام کا پرچم ہے ہلالی دیکھو

انسان نے جو یہ رتبہ عالی پایا
آدم نے جو یہ وصف جمالی پایا
جس نور حقیقت کے یہ سب پر تو ہیں
وہ حسن محمد نے کمالی پایا

شاعرانِ بہار کی رباعیوں پر ذکر سرور کائنات کے تعلق سے نگاہ ڈالتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی رباعی کے ساتھ، یہاں دربار رسالت میں ایک ایسا شاعر بھی کھڑا ہے جس کی شہرت اشتراکی اور سرخ انقلابی شاعر کی حیثیت سے ہے۔ اس شاعر کو دنیا پرویزؔ شاہدی کے نام سے جانتی ہے ؎

تکمیل نبوت کی قسم کھاتا ہوں
معراج حقیقت کی قسم کھاتا ہوں
دنیا کو نہیں پیام نو کی حاجت
میں ختم رسالت کی قسم کھاتا ہوں

پرویزؔ شاہدی کی یہ رباعی ختم نبوت کے عقیدے کا حلفیہ اعلان ہے اور شاعر نے بالکل سچ کہا ہے کہ پیام رسالت کے بعد اب دنیا کو کسی پیام نو کی حاجت نہیں۔

پرویزؔ شاہدی نے ظاہر ہے کہ ایک خاص زمانے سے ہی کمیونزم کا نظریاتی اثر قبول کیا تھا اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی یہ رباعی اُس زمانے سے قبل کی ہے اور اس میں کیا شک کہ بہت خوب ہے۔

بہار کے شعرا میں علقمہ شبلی اور ظفرؔ انصاری بھی شامل ہیں، آیئے ان کی رباعیوں سے فیض پائیں، جن میں نبی پاک کا ذکر کرتے ہوئے ان کی رحمت وشفاعت، خلق ونور اور ان کے دیار پاک کی باتیں ہوئی اور مزید برآں تنسیق صفات کا استعمال بھی دیدنی ہے ؎

وہ نورِ خدا ، رحمت عالم بھی ہیں
امت کے ولی خلق مجسم بھی ہیں
کس طرح لکھے نعت محمد شبلؔی
احمد بھی ہیں پیغمبر اعظم بھی ہیں

کیا عرض کروں گنبد خضرا کی بات
ملتی ہے یہاں روح کو نوری سوغات
تصویر بہاراں ہے مدینہ ہے یہ
ہوتی ہے یہاں بارش رحمت دن رات

(علقمہ شبلی)

وہ رحمت عالم و شفیع محشر
وہ صاحب لولاک حبیب داور
وہ مظہر حق ، ختم رسل ، نورِ خدا
کونین میں کوئی نہیں ان سے بہتر

(ظفرؔ انصاری)

❁❁❁

مدینہ

مکے کا سراپا ہے سراپائے مدینہ
وہ 'میم' مدینہ ہے تو یہ 'ہائے' مدینہ
کہتا ہے ارم دیکھ کے شیدائے مدینہ
اس سے تو کہیں خوب ہے صحرائے مدینہ
دل میں مرے ہو جائے اگر جائے مدینہ
کعبے میں نظر آئے تماشائے مدینہ
دل میں ہے جگہ آپ کی ابلیس کو کیا دخل
دجال سے ایمن ہے شہا جائے مدینہ
وہ آنکھ نہیں جس کو نہ ہو شوق زیارت
وہ دل نہیں جس میں نہ ہو سودائے مدینہ

—— ہادی حسن خاں نایابؔ

مقالات

رئیس الدین رئیس
10/1725, Delhi Gate, Aligarh-202001 (Mob.9719570345)

قمر نقوی نقشبندی بحیثیت ناول نگار

ایسے دانشور بہت کم پیدا ہوتے ہیں جنہیں نظم اور نثر دونوں شعبوں میں کمال حاصل ہوتا ہو۔ عام طور سے شاعر، نثار نہیں ہوتا، ادیب اچھا شاعر نہیں ہوتا اور ادیب وشاعر ہرگز خطیب نہیں ہوتا۔ مغربی ادب میں بھی ایسا ہی ہے شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزی کا ادیب، شاعری کی طرف راغب نہیں ہوتا اور مغربی شاعر کی توجہ نثر کی طرف نہیں ہوتی، لیکن قمر نقوی نقشبندی اس عمومی کلیہ سے الگ ہیں۔ وہ ایک ہمہ جہت، ہمہ صفت موصوف قلم کار ہیں۔ شاعری ان کی جاگیر، نثر ان کی ملکیت، خطابت ان کی عادت اور شکار ان کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ جو یوسف کامران نے کہا تھا:

> ''جانے آپ نے اتنا بہت سا علم، اس قدر صفات اتنی قابلیت کس طرح جمع کر رکھی ہیں، شکاریات، ناول، علمی کتاب اور شعروسخن، پھر علمی مضامین و مقالات، تحقیق وتنقید، دینی خدمات آخر آپ کیا کچھ کر دکھانا چاہتے ہیں نقوی صاحب۔''

قمر نقشبندی یقیناً بیک وقت متعدد خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ محقق بھی ہیں، نقاد بھی، عالم بھی ہیں فاضل بھی، تاریخ داں بھی ہیں مورخ بھی، عروض داں بھی ہیں اور باکمال شاعر بھی، صوفی بھی ہیں دنیا دار بھی، ماہر دینیات بھی ہیں اور منزل معرفت کے مسافر بھی، دستار بند عالم باعمل بھی ہیں اور انگریزی لباس میں ملبوس جدید وضع کے انسان بھی۔

شاعر اور ادیب تو خیر ہیں ہی، حیرت کی بات تو یہ کہ وہ شکاری بھی ہیں، جہاں ان کی زبان سے نزاکت ولطافت کے موتی برستے ہیں وہیں، ان کی بندوق سے ہلاکت آفرینی کی بارش بھی ہوتی ہے۔ وہ اگر نہایت عمدہ ترنم کے ساتھ جھومتی ہوئی غزل سناتے ہیں تو ان کے شانے پر رکھی بندوق کی آواز دل بھی دہلا سکتی ہے اور مستزاد یہ کہ وہ صحافی بھی ہیں، متحدہ عرب امارات کے انگریزی روزنامے "Emirates News" کے نیوز ایڈیٹر رہ چکے ہیں ٹلسا، امریکی روزنامہ "Daily Lwdger" میں لکھتے رہے اور دوماہی ''اردو باتصویر'' اور رنگین رسالہ ''روشنی'' شائع کر کے ادب دوست اردو پرستوں سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔

شکاریات پر لکھنے کا آغاز قمر نقوی نے ہی کیا اور ان کے قصے ''اردو ڈائجسٹ'' لاہور میں شائع ہونے شروع ہوئے جن کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کئی قلم کاروں نے اس موضوع کو اپنایا اور جلد ہی یہ صنف رسالوں کی کامیابی کی ضامن بن گئی، لیکن جو حسن بیان، لطافت اظہار، اسلوب منظر کشی، الفاظ پر قدرت اور تناسب روایات قمر نقوی نقشبندی کو نصیب ہے اس تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ شکاریات کو ادب کا مقام دینے والے قمر نقوی نے شکاریات کے نام سے ادب کے شاہکار تخلیق کیے ہیں۔

قمر نقوی کی جائے پیدائش اور وطن مالوف بھوپال ہے اور امریکہ میں مستقل سکونت کے باوجود انہوں نے اپنی جائے پیدائش سے جس محبت اور تعلق کا رویہ برقرار رکھا ہے وہ اہل بھوپال کے لیے خوش کن ہے۔ قمر نقوی نے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور فضیلت کی تفسیر اور سیرت مبارک کی تحریر کو اپنا وطیرہ بناتے ہوئے دو کتابیں انگریزی میں تالیف کیں:

(1) Tha Last Sunrise of Prophethood

(2) Prophet of Islam

ان کے تصنیف کردہ افسانوں کی تعداد کا علم نہیں، لیکن ان کی اشاعت اس وقت شروع ہوئی جب یہ نو سال کے تھے اور دہلی کے رسالے ''عصمت'' اور لاہور کے رسالے ''عالمگیر'' میں ان کی کہانیاں بچوں کے صفحات میں شائع ہونا شروع ہوئیں اور ''عصمت'' کے علامہ راشد الخیری اور ''عالمگیر'' کے حافظ محمد عالم نے ان کی پذیرائی کی۔

پاکستان میں ان کی پہلی تالیف ''منظوم حیات قائد اعظم محمد

علی جناح'' رفیق بک ڈپو، حیدرآباد سندھ سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی جو ساڑھے تین سو صفحات اور تقریباً تین ہزار اشعار پر پھیلی ہوئی قائداعظم کی پہلی منظوم سوانح تھی، اس کم عمری میں جب کہ قمر نقوی صرف اٹھارہ انیس سال کے تھے اتنی طویل نظم اس حسن بیان اور خوبی اسلوب کے ساتھ تخلیق کرنا ایک کارنامہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ان کی فطری صلاحیت اور قدرتی استعداد شاعری ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

قمر نقوی کا پہلا مکمل ناول ''حادثات'' یا ''پراسرار لفافہ'' شیخ غلام اینڈ سنز نے لاہور سے شائع کیا تھا اس کے بعد ان کے کئی ناول مقبول اکیڈمی لاہور نے شائع کئے جیسے:

(۱) راحلہ (۲) ندیمہ (۳) گلگونہ (۴) راوی کنارے
(۵) مسافر (۶) اور گھنٹی بجتی رہی (۷) چیتوں کی وادی
(۸) کاشفہ (۹) کشید بہار (۱۰) پراسرار جزیرہ
(۱۱) تلاش منزل (۱۲) رازداں (۱۳) جلتے ہیں چراغ
(۱۴) ہم سفر (۱۵) ہم نوا اور (۱۶) نوشگفتہ

ان ناولوں کے بارے میں مفصل جائزہ لازمی ہے، لیکن اس سے پہلے ان کی نثری تخلیقات میں ان چند کتابوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو ناولوں کے دوش بہ دوش منصۂ شہود پر درخشاں ہوتی رہیں۔ یہ تالیفات علم وادب میں اضافے کہے جائیں تو درست ہوگا:

(۱) تین عظیم فلسفی (۲) صلیبی جنگیں (۳) اردو شاعری کی
آخری کتاب (فن عروض پر جامع تالیف) (۴) صحائف انبیاء

قمر نقوی کی دو کتابیں ''آٹھ آدم خور شیر'' اور ''بالم پور کا آدم خور شیر'' فیروز سنز نے شائع کیں۔ باقی جو مقبول اکیڈمی نے شائع کیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) گنڈولا کا آدم خور شیر (۲) مادھوپور کا آدم خور (۳) فسادی
شیر (۴) شکار نامہ (۵) شکار بیتی (۶) شکار شاہ کار
(۷) بھگت گڑھ کا آدم خور (۸) امریکہ میں شکار۔

ان کی تصنیفات اور تالیفات کی اس طویل اور قابل قدر فہرست میں نہ تو ان کے شعری مجموعے شامل ہیں نہ وہ طویل نظم جو پاکستان اور ہندوستان کی مکمل، مفصل اور مستند تاریخ حماسہ ''منظوم تاریخ ہند و پاکستان'' ہے۔

قمر نقوی کا فطری رجحان ناول ہی کی طرف رہا۔ شکار کی کتابیں بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں، شکار اور ادب کے دشت کی سیاحی میں قمر نقوی نے زندگی گزار دی ہے اور وہ کچھ کیا جو بالعموم بہت مشکل کام ہے۔

قمر نقوی کے ناولوں کو اگر اس تناظر میں دیکھا جائے جیسا کچھ اوپر بیان کیا جا چکا تو ہمارے پیش نظر ایک ایسے شخص کی تخلیقات آجاتی ہیں جسے فنی اصولوں اور لوازمات پر نہ صرف عبور حاصل ہے، بلکہ ان کے صحیح استعمال کا قرینہ بھی آتا ہے، قمر نقوی کی تحریر، رنگ و نور میں ڈوبی، شیرینی بیانی واظہار کے اوصاف سے مزین، ناول نگاری کی جدید تکنیک سے آراستہ ایسی خوبصورت کہانیاں ہوتی ہیں جن کو ایک بار پڑھنا شروع کیا جائے تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا، مثلاً ان کا پہلا ناول ''پراسرار لفافہ'' جسے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا تھا، جنگ جہانی دوم کے سلسلے کی کہانیوں کی ایک کڑی ہے۔ کلکتے کا ماحول اور کہانی کی ابتدا ہی ایک ایسے سنسنی خیز واقعے سے ہوتی ہے کہ توجہ فوری طور پر اسی میں جذب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ان کا دوسرا ناول ''راحلہ'' ہے جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

راحلہ قصے کے مرکزی کردار کا نام ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص ایک قتل کے سلسلے میں اپنے کو مجرم تصور کرتے ہوئے قانون سے چھپتا پھرتا ہے اور اتفاقاً ہیروئن کے گھر وارد ہوتا ہے جسے وہ دھمکا کر اعانت پر مجبور کر دیتا ہے، لیکن یہ صورت حال بتدریج ہمدردی میں بدل جاتی ہے اور کچھ عرصہ گزرتا ہے تو دوستی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

راحلہ ایک انتہائی دلچسپ، نہایت اعلیٰ تکنیکی اسلوب سے لکھا گیا کامیاب ناول ہے، اس میں جگہ جگہ سنجیدہ صورت حال بھی ہے اور خوش مزاجی اور شائستہ مزاح بھی ہے۔ چست اور دلچسپ مکالمے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ الفاظ کی مناسبت، بیان کی چستی، واقعات کی پیوستگی اور ایک ایسا دلکش انداز اس ناول میں ملتا ہے کہ کہانی ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک معراج کی طرف مسلسل سفر کرتی ہے اور قاری اس کا ہم سفر بن جاتا ہے۔

اسی طرح قمر کا نہایت کامیاب اور ایک نئے حال پر مبنی ناول ''ندیمہ'' بھی ہے۔ ''ندیمہ'' کا آغاز ہی چونکا دینے والا ہے:

''آسمان کے ایک دریچے سے دو فرشتوں نے خلا کی طرف

دیکھا اور پھر ان کی نگاہیں کرۂ ارض پر مرکوز ہوگئیں اور وہ جھانکتے رہے حتیٰ کہ ان کے ایک تیسرے ساتھی نے ان کو پکارا...... 'کیا جھانک رہے ہو......؟' 'کرۂ ارض کی طرف دیکھ رہے ہیں......' 'کیا ہے وہاں......؟' نہ جانے کیسا بدبخت سیارہ ہے، کائنات کی ہر شئے خالق کی نعمتوں سے سرشار ہے، مگر یہ کرہ زمین کا یہ گولا ابھی تک ویسا ہی ہے...... اس کی حالت ہی نہیں بدلتی......' تیسرا فرشتہ بھی جھانکنے لگا...... دھواں ہی دھواں، بادل ہی بادل، آندھیاں، طوفان، تلاطم......''

یہ ابتدائے کرۂ ارض کی اجمالی کہانی ہے، مگر ایسی کہ فوراً متوجہ کر لیتی ہے اور ناول شروع کرتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی نئی بات کہی جا رہی ہے۔ اسی طرح حضرت آدم کی تنہائی دور کرنے کے لئے جب اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے حوا کو پیدا فرمایا تو اس کی منظر کشی قمر نقوی نے یوں کی ہے:

''آدم اب تک غافل پڑا تھا کہ اس کو اپنے رخسار پر کوئی شئے حرکت کرتی محسوس ہوئی اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ایک لمحہ بغور دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں، وہ سمجھا خواب دیکھ رہا ہے، لیکن اس کے رخسار پر دوبارہ کسی شئے نے حرکت کی تو اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے قریب جو ایک حور بیٹھی تھی وہ ان حوروں سے مختلف تھی جو اب تک اس نے وہاں دیکھی تھیں...... یہ حور تو نہ تھی...... یہ تو نہ جانے کیا تھی؟ 'تم کون ہو' آدم نے ایک کہنی کے زور پر اٹھتے ہوئے پوچھا...... 'حوا' کیسی شیریں آواز تھی جیسے نغمہ اور آدم کے اطراف میں نور ہی نور پھیل گیا......''

یہ کہانی ان تین فرشتوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرش زمین پر بھیجے گئے اور حالات عالم کا مشاہدہ کرتے رہے۔ اس انداز اور کہانی کا کوئی ناول شاید دنیا کے کسی زبان میں موجود نہیں۔ قمر کی ساری کہانیاں طبع زاد اور اصل ہوتی ہیں جن میں کسی کی خوشہ چینی نہیں کی جاتی ہے۔

اس ناول میں تقسیم ہند کے دوران فسادات میں لٹی ہوئی انسانیت کا بھی ذکر ہے اور اس بیان کے ہر لفظ سے خون ٹپکتا ہے۔ بیچارگی منعکس ہوتی ہے، مظلومیت برستی ہے اور دل ٹکڑے ہونے لگتا ہے۔

اب ندیمہ کا قصہ شروع ہوتا ہے جو فسادات کی ماری، مظلوم اور بے کس بچی ہے۔ کہانی اسی کے گرد گھومتی ہے کہ وہ کس طرح پروان چڑھتی ہے، کن حالات سے گزرتی ہے اور اس دور کے عام حالت میں کس طرح گزر کرتی ہے، ساتھ ہی معاشرے کی ان برائیوں کی طرف طنزیا اشارے کئے گئے ہیں جن کے بارے میں کم لوگ جانتے تھے۔

واقعے کے دوران شیطان اور ان تین فرشتوں کی آویزش بھی جاری رہتی ہے اور جا بجا ان کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔

''ندیمہ'' ایک غیر معمولی خوبصورت کہانی ہے۔ اس کا آغاز ہی بالکل نیا، اچھوتا اور دلکش ہے، جس میں انہوں نے ایسا انداز بیان اختیار کیا جو عام روش سے ہٹ کر قدرتی اور فطری تاثرات کا حامل اور معاشرے کی متعدد خامیوں کوتاہیوں اور کج رویوں کو بے نقاب کرنے والا ہے۔ اس میں تحیر خیز مقامات بھی آتے ہیں، غمناک پہلو بھی ملتے ہیں، الجھنیں بھی سر اٹھاتی ہیں، خوش مذاقی اور لطیف جذبات کے مواقع بھی آتے ہیں، لیکن ان کا حسن بیان سارے مسائل کو ایک ایسی جاذب توجہ اور حقیقت آفریں تصویر کی شکل دے دیتا ہے جو بس انہیں کا طرۂ امتیاز ہے۔

اردو زبان میں اس انداز کا کوئی دوسرا ناول نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنے منفرد انداز بیان، کردار نگاری اور واقعہ بیانی کے فن میں برصغیر کے سارے ادیبوں سے بلند و برتر ہیں تو قطعاً درست ہوگا۔ واقعہ نگاری تمثیل کاری، حسن بیان، رعنائی الفاظ، چستی مضمون اور اخلاقیات میں ان کا کوئی ہم سر نہیں۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق:

''میں نے ہیچ مدانی کے نقطے سے سفر کا آغاز کیا اور اللہ تعالیٰ سبحانہ کے ودیعت کردہ محاسن و اہلیت کے تحت بتدریج علوئے ذات کی منزل کی طرف گامزن رہا، یہاں تک کہ میں 'فضیلت ذات' تک پہنچا۔ یہاں سے میرے ذوق تجسس اور تحقیق کا آغاز ہوا، اس کا ہدف صرف 'کمال ہنر' تھا! اس میں خارجی اثرات کا اتنا کردار نہیں جتنا ودیعت الٰہی کا ہے...... اللہ واسع العلم...... میں نے اپنے ذاتی شرف اور حقیقت اسرار کی آگہی حاصل کی اور

بحمد اللہ فکر وحل کے ان مقامات تک پہنچا جہاں 'شہرت'
مجھے بے حد حقیر معلوم ہونے لگی۔ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے
لوح وقلم میرے سپرد کئے اور حکم دیا کہ میں تحریر وتقریر کا کام
کروں، مکاری یا اداکاری سے واسطہ نہ رکھوں۔ میں اس
میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتا اگر لوگ مجھے وہی کچھ جانیں
جو میں دراصل ہوں، اپنی اصلیت، اپنی خلقت کو چھپانا
ضروری نہیں، اس اصلیت، حقیقت اور خلقت کو ترقی دینے
اور فضیلت ذاتی حاصل کرنے میں ہی خوبی ہے۔''

اسی طرح ان کا ناول ''اور گھنٹی بجتی رہی'' بھی ایک منفرد تخلیق ہے۔ سارا ناول صرف ٹیلیفون کالس پر ہی منحصر ہے۔ یہ بھی قمر نقوی کا کمال نگارش اور حسن بیان کی اہلیت ہے کہ سارے ناول میں ٹیلیفون کے مکالمات کو اس خوبی کے ساتھ مرتب کیا اور اتنا دلچسپ بنایا ہے کہ کتاب شروع کرنے کے بعد رکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ بات ساری یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص آواز بدل کر کہانی کے مرکزی کردار کو محبت کے طلسم میں گرفتار کر دیتا ہے۔ ملاقات تو نہیں ہوتی، لیکن اس ناول کے مکالمات اس قدر رنگین، ایسے چست، ایسے دلکش ہیں اور ان میں ایسی عجیب جادو بیانی ہے کہ یہ ناول اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک نہایت کامیاب ناول اور ایک بہت ہی دلکش کہانی ثابت ہوئی۔

''راوی کنارے'' ایک ایسی دلکش اور سلجھی ہوئی کہانی ہے کہ قاری اس کے ماحول میں جذب ہو کر اپنے کو بھی اس کہانی کا ایک کردار سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

''مسافر'' ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو مستقل سفر میں رہ کر مہمانی کے ذریعے ہی زندگی گزارتا تھا تو ''گلگونہ'' ایک دلکش افسانوی، معاشرتی ناول ہے اور ناول ''سرگزشتہ'' تین ایسے بچوں کی کہانی ہے جو ایک ہوائی حادثے میں اتفاق سے بچ جاتے ہیں۔ یہ ہوائی جہاز وگنڈا کے گھنے جنگلی علاقے میں گر کر تباہ ہوا۔ ایک بچی علیحدہ ہو جاتی ہے، جب کہ دو بچے ساتھ ہوتے ہیں ان کی مصائب بھری زندگی، افریقہ کے جنگلی قبیلے میں زندگی، وہاں کے رسوم و رواج، پھر بچوں کا فرار، غرض کہ یہ ناول نہایت عجیب وغریب واقعات اور ادب وحسن بیان سے مزین ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں ناول نگاری کا عروج چند ایسے قابل تعریف ادیبوں سے ہوا جو اپنے زمانے میں آسمان ادب پر ستاروں کی طرح جگمگاتے رہے جیسے کرشن چندر، بیدی، علی عباس حسینی، منٹو، احمد عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر وغیرہ۔ اس دور کے آس پاس ہی کچھ ایسے ادیب بھی تھے جو عام دھارے سے ہٹ کر اخلاقیات اور پاکیزگی خیالات پر منحصر رومانی ناولیں تخلیق کر رہے تھے ان میں اے۔ آر، خاتون، فیاض علی، راشد الخیری وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

قمر نقوی اس دور میں ان تمام روایات کے حامل ہیں جو عہد رفتہ کے ادیبوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے قائم کیں، بلکہ انہوں نے ان روایات کو مزید جلا عطا کی اور ان میں وہ جدید روح پیدا کر دی جو ان کی خصوصیت ہے۔ قمر نقوی نے اپنے کئی ناولوں کو ان کی کہانیوں کی ہیروئنوں کے نام کا عنوان دیا، جیسے ''راحلہ''، ''ندیمہ''، ''گلگونہ'' وغیرہ۔ یہ سارے ناول، اسلامی معاشرے کے پس منظر میں مرتب ہوئے، ان کے کردار اسلامی معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں، ان ناولوں میں پیش کی گئی محبت کی اپنی ایک تہذیب ہے، ایک شائستگی ہے، ایک حیا ہے، جس کا اہتمام قمر نقوی کے یہاں نمایاں ہے۔

قمر نقوی کے ناولوں میں انسانی سچے جذبات کی مہک ہے، ان میں ایک ایسی لطافت، موسیقی ریز ترنگین ہیں جو قلب و روح کے تاروں کو چھیڑ کر مست و بے خود بنا دیتی ہیں۔ قمر نقوی نقشبندی واقعات کے ترتیبی نظام کے ساتھ ہی جذبات کے محرکات اور ان کے منفی ومثبت اثرات کا ایسا عجیب مرکبہ کچھ ایسے فنکارانہ انداز سے قائم کرتے ہیں کہ سب ہی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر دلکشی اور ادب کے جمیل نقوش بن جاتے ہیں، ان کا حسن بیان اور اس کی بے ساختگی اس قدر پر اثر ہے کہ قاری بے اختیار ہو کر ان کے آگے خود سپردگی قبول کر لیتا ہے وہ انہیں کے مزاج اور انداز میں گھل مل جاتا ہے۔ وہ ہنساتے ہیں تو ہنستا ہے، وہ رلاتے ہیں تو روتا ہے۔ وہ سنسنی پھیلاتے ہیں تو سہم جاتا ہے اور وہ شگفتگی کا پیام دیتے ہیں تو وہ مسرت سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ طاقتور بیانیہ انداز کا یہ سحر ان کے سبھی ناولوں میں موجود ہے۔

قمر نقوی کا فطری میلان صرف دھیمی آنچ کے سلگتے ہوئے

رومان تک ہی محدود نہیں ہے، وہ مہماتی تحیر خیزی اور طلسماتی خوف کے خالق بھی ہیں، تحیرافزائی اور سنسنی بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

شکاریات کے موضوع پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں، انہوں نے اس موضوع کو ادب کا مقام عطا کیا ہے۔ ان کی شکاریات کے قصوں میں وہ سارے اوصاف پائے جاتے ہیں جو کسی بھی کہانی کو عالمی ادب کے مقابلے میں لاتے ہیں۔

اکثر ناولیں، کہانیاں اور افسانے ان کے اپنے تجربات، مشاہدات اور چشم دید واقعات پر منحصر ہوتے ہیں، یہی سبب ہے کہ ان میں اس قدر سچائی، اتنی اصلیت اور ایسی قدرتی زیبائی ہے کہ ان کے فکشن میں واقعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مناظر کے بیان پر ان کی قدرت حیرت انگیز ہے اور ایسے موقعوں پر ان کے الفاظ و بیان پر قدرت انہیں بے شمار ناول نگاروں سے بلند کر دیتی ہے۔

شکاریات ایک علیحدہ موضوع ہے اور ان کے بارے میں وہی صحیح جائزہ پیش کر سکتا ہے جو خود اس دشت کی سیاحی کرتا رہا ہو۔ اگر ان کی شکاری تالیفات کو دیکھا جائے تو ان سب میں وہی حسن بیان اور خوبی مشاہدہ عیاں ہوتی ہے جو ان کی تمام تحریروں کا وصف ہے، وہ جس منظر کی بات کرتے ہیں اسے گویا اپنے زور قلم سے زندہ کر کے پڑھنے والوں کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ جنگل میں شام کی آمد بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''سر بہ فلک کشیدہ پہاڑوں اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے تناور درختوں پر سرخ رنگ ایسے پھیل رہا تھا جیسے غروب ہوتے ہوئے سورج نے ان پر رنگ پھینک دیا ہے، سائے لانبے ہوتے جا رہے تھے اور ان پر گہرا سیاہ رنگ غالب آتا جا رہا تھا، شام کے نزدیک ہوا کے جھونکوں میں سبکی اور لطافت کی موجیں اٹھ رہی تھیں۔''

یہ بیان شکار کی کتاب کا بیان تو معلوم ہی نہیں ہوتا، ایسا لگتا ہے کہ یہ کسی نہایت اعلیٰ ادبی کتاب کا بیان ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قمر نقوی کی شکار کی ہر کتاب کا بیان کچھ اسی طرح ادب کا شاہکار ہوتا ہے۔ یقیناً جمیل الدین عالی کا یہ کہنا درست ہے:

> ''آپ کی ذات میں اتنی صفات کا اجتماع ہے کہ بعض وقت سوچتا ہوں آپ کیا ہیں اور کیا کر دینا چاہتے ہیں۔''

اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ ناول نگاری میں قمر نقوی ایک منفرد اسلوب نگارش کے مالک ہیں، ان کے ناولوں کا آغاز بڑا ہی دلکش اور متوجہ کرنے والا ہوتا ہے، وہ کہانی کی منطقی ترتیب اور اس کے تدریجی ارتقا پر گہری نظر رکھتے ہیں، بے جا مبالغہ آرائی اور لفاظی سے پرہیز کرتے ہیں، ان کے اکثر ناولوں میں مزاح کی شوخی اور شائستگی میں ملے ہوئے طنز اور تیکھے پن کی جھلکیاں واضح ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ قمر نقوی اردو ناول کے چند جدید معماروں میں شمار ہوتے ہیں، ان کے ناولوں کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ کرداروں کے برجستہ اور بے ساختہ مکالموں سے کردار نگاری اور منظر نگاری کا کام لیتے ہیں۔ وہ مکالموں کے ذریعے ہر قسم کے جذبات کی عکاسی کر دیتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان کے لکھے مکالمات، حقیقتوں کے ایسے دلکش نقوش ہیں جو دل کو موہ لیتے ہیں اور طبیعت میں ایک سرور و انبساط پیدا کرتے ہیں، ان کے الفاظ کی رعنائی کسی مقام پر دل کے تاروں کو مرتعش کر دیتی ہے، ان کے مکالموں کے ذریعے بولنے والی مکمل تصویر پیش نظر آ جاتی ہے ایسا کمال شاذ و نادر ہی کسی کو میسر ہو۔

قمر نقوی کے ادب کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے قلم سے کوئی فحش جنسیاتی، عریانیت کے عنصر سے ملوث یا تہذیب دینی کے خلاف کوئی عبارت رقم نہیں ہوتی اور یقیناً یہ ان کے دینی رجحان کا ایک عکس ہے۔ ❁❁

خریدار اور کرم فرما حضرات سے......

''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعتیں، خریدار اور کرم فرما حضرات کے پتہ پر بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ پرچہ سادہ ڈاک سے روانہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ کے تاخیر سے ملنے یا نہیں پہنچنے کی صورت میں، اپنے علاقہ کے ڈاکیہ اور مقامی ڈاک خانے سے رجوع کریں۔ ادارہ ڈاک میں پرچہ کی گم شدگی کا ذمہ دار نہیں۔

ڈاکٹر اسلم جاوداں

Darul Gheyas, Urdu Gali (Jamun Gali) Sabzibagh, Patna 800004, (Mob. 7903117915)

صحیح اردو کیسے بولیں؟

صحیح تلفظ شخصیت کی شان اور دانشوری کی پہچان ہے۔ غلط تلفظ ہماری شخصیت کو مجروح اور سبک کردیتا ہے، لہٰذا ہمیں اپنی گفتگو اور تقریر دونوں میں تلفظ کے معاملے میں خاصا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ذیل میں ہم ان الفاظ کے صحیح تلفظ کی نشاندہی کررہے ہیں جنہیں ہر اہل زبان اور دانشور اردو کو جاننا ضروری ہے۔ یہ الفاظ ہماری گفتگو اور تقریر میں عام طور سے مستعمل ہیں:

(۱) ان الفاظ میں پیش (ـُـ) نہیں زبر (ـَـ) ہے۔

مَبلَغ، مَبَاحِث، مَحکمه، مَقاله، مَشَقَّت، مَرمَت، حَبَاب، سَراب، رَباب، دَرویش، رَستگاری، مَبدّاء، مَرغزار (چراگاہ) مَنفَعَت، مَنفِی، مَوقِف، نَجات، نَدامت، نَشاط، نَقص، عَمود، وَدود

(۲) ان الفاظ میں زیر (ـِـ) ہے زبر (ـَـ) نہیں۔

اِکسیر، اِراده، اِحاطه، اِزدواج، اِزدحام، اِساس، استِحقاق، اِفطار، اِغوا، اِفشاء، جِماع، خِیانت، دِفاع، دِین (دیا ہوا، عطیہ) رِضا، رِفعت، رِسالت، زِمام، زِنا، سِرشت، سِتیزه کار، شِگفته، شِگوفه، شِفا، صِیام، عِنایت، علاوه، عِیادت، فِرار، فِرومایه، فِریب، فِراسَت، فِرشته، فِسق، کِنایه، گِراں، گِرفت، لاحِق، مِهمیز، نِشیمن، نِقاب، نِکات، نِقاط۔

(۳) ان الفاظ میں زبر (ـَـ) ہے زیر (ـِـ) نہیں:

اَخلاق، بَیاض، جَرّح، جَهالت، حَماقَت، رَیحان، رَکعَت، رَکاکت، شَجَره، عَلاقه (جگہ)، فَضا، گَناره (بغل) کشتی (ناؤ)، لَباده، نَکهت، وَقار، وَش (جیسے: مہوش)

(۴) ان الفاظ میں پیش (ـُـ) ہے زبر (ـَـ) نہیں:

اُمور، تُوانا، تُونگر، ثُبوت، جُمود، دُرود، سُهولت، سُقم، سُتون، شُعور، شُهود، شُکَوه (شان)، شُیوخ، صُعوبت، طُیور، طُرفه (انوکھا)، طُفولیت، ظُهور، عُشر عَشیر، عُضو، عُیوب، غُرور، فُقدان، کُنجشك، گسوف، کُبَن، قُبور، مُحابَا، مُحاوَره، مُختص، مُدغَم، مُمالك، مُملِکت، مُنافِع، مُثبت، مُعَاف، مُعَامَله، مُحاسِن، مُیسر، نُبوت، نُزول، وُضو (نماز کے لئے منھ ہاتھ دھونا)، وُجُوب، هُجوم۔

(۵) ان لفظوں کا دوسرا حرف ساکن نہیں ہے:

اَهم حَنَفی، دَرَجَه، رَقَم (لکھنا) سَبَقَت، سَلَف، شَرَف، صَحَرا، صَدَقَه، غَرَض، غَلَبَه، غَلَطی، قَدَح، مَثَل (کہاوت) مَرَض

(۶) ان لفظوں کا دوسرا حرف ساکن ہے:

جَهْل، جَرْح، ذَبْح، رَقْم (روپیه پیسه)، سَهْو، سَطْح، سَطْر، شَرْح، شَکْل، صَدْر، صَحْن، صُلْح، صَبْر، ظَهْر، عَصْر، غَدْرُ، فَجْر، فَتْح، فَهْم، فِقْه، کِذْب، قَبْل، مِثْل (مانند) مَنْع، مَدْح، مَحْو، هَجْو، نَفْع، نَفْل۔

(۷) ان الفاظ کا تیسرا حرف ساکن نہیں ہے:

تَجرِبَه، تَفرِقه، حادِثه، عَرّفَه، عَارِضه، مَدرَسَه، وَارِدات، وَاقِعه

(۸) ان الفاظ پر تشدید (ـّـ) نہیں ہے:

کَرَه، بِجے، کَنّیت، مَترجِم، بَقّعه، عِظام، اِتّمام، چِهلَم

(۹) ان الفاظ میں تشدید ہے:

نشّه، توّاب، وهّابی، عبدالوهّاب، مَسوّده، مَقدّمه (تمہید)، عَطِیّه، مُحوَّله (م.حو.و.له)، مُتموّل

(مُ۔تَ۔مَوْ۔وَّل)

(۱۰) ان الفاظ کو عام طور سے لوگ غلط تلفظ کے ساتھ پڑھتے ہیں:

ادبی (اَ۔دَبی) اَرُجَمَند (اَرُ۔جُ۔مَند)

ازدحام (اِز۔دِ۔حَام) ازدواج (اِز۔دِ۔وَاج)

اذکار (اِذ۔کَار) اراضی (اَ۔رَا۔ضِی)

اِستِحِقاق (اِس۔تِحِ۔قَاق)

اِستِدعَا (اِس۔تَد۔عَاء۔ **درخواست**)

اِستِعداد (اِس۔تِ۔ع۔دَاد) اِستِعمال (اِس۔تِ۔ع۔مَال)

اِستِقبال (اِس۔تِ۔ق۔بَال) اِستِقلال (اِس۔تِ۔ق۔لَال)

اِطِلاع (اِطْ۔طِ۔لاع) اِقدام (اِق۔دَام۔(**قدم اُٹھانا**)

بُعْدَالمَشرِ قَین (بُع۔دَلْ۔مَش۔رِقَین)

بُوس وکِنار (بُ۔س۔و۔کِنا۔ر)

تَفرِقَه (تَف۔رِ۔قَه) تَجرِبَه (تَج۔رِ۔بَه)

تَحتَ الثریٰ (تَحْ۔تَتْ۔ثُریٰ)

تَہلکَه (تَہہ۔ل۔کہ) جَہَنمَّ (جَ۔ھَن۔نَّم)

حَتٰی الُسع (حَتْ۔تَل۔وُسْع)

خُنُک (خُ۔نُک) سُبُک (سُ۔بُ۔ک)

شُعراء (شَ۔ع۔رَاء) صا—حب

صِحَّت (صِح۔حَت) غَلَطی (غَ۔لَ۔طی)

کنارہ (کنا۔رہ) گِرِفُتُ (گِ۔رِفُت)

مُتَارِف (مُ۔تَعَا۔رِف) مُتَزَلزِل (مُ۔تَ۔زَلْ۔زِلُ)

مُتَصِف (مُت۔تَ۔صِف) مُعَنوَن (مُ۔عَن۔وَن)

وَابَستہ (وَا۔بَس۔تَه) مُطَالَعَه (مُ۔طَا۔لَ۔عَه)

مُعَاف (مُ۔عَا۔فُ) مُعَامَلہ (مُ۔عَا۔مَ۔له)

(۱۱) ان الفاظ کے دونوں تلفظ درست ہیں:

بُلند/بَلند	بَرَهْنَه/بَرهَنّه
بَرَکت / برکت	حَرکت/حَرَکت
حَلَف/حَلْف	زُبان/زَبان
سُوال/سَوال	مُزدور/مَزدور
سَمت/سِمت	سَبقَت/سَبُقَت
مؤسَم/موسِم	مُسرّت/مَسرّت
مَحبت/مُحبت	طَرَح/طَرُح
نشَّه/نَشه	

❁❁❁

نئی شاعری اور تنقید نگار

ادب اور شاعری کی قدیم وجدید کے خانوں میں تقسیم بہرحال تاریخ کا یک گونہ جبر ہے، جسے قبول کئے بغیر چارہ نہیں، مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ادب ہو یا شاعری، وہ بہرصورت اپنے اپنے دور کا عکس وآئینہ ہے۔ جب قدیم اور کلاسیکل شاعری کے مقابلے میں نئی شاعری کی بات ہوتی ہے تو ہمارے ناقدین اسے نہایت سطحی اور الجھی ہوئی شاعری بتاتے ہیں، لیکن یہ فنکار کا قصور نہیں، اس لئے کہ ادیب ہو یا شاعر، وہ کسی وجہ کے بغیر نہیں لکھتا۔ اگر یہ الجھی ہوئی شاعری ہے تو کہنا چاہئے کہ بالکل اپنے وقت اور عہد کی طرح الجھی ہوئی، بے معنی اور جھلائی ہوئی ہے، اس پر سرکہ جبیں ہونا فضول ہے۔ ایک وقت تھا جب ترقی پسند شاعری کی نعرے بازے بھی ناقدین کو آشفتہ خیال بنا دیا کرتی تھی اور اس پر ہمارے ناقدین عالمانہ ہی نہیں بلکہ بسا اوقات بچکانہ اظہار خیال سے بھی باز نہیں رہتے تھے، یہاں تک کہ جب نئی شاعری کا زمانہ آیا تب بھی اس کی تعریف کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادب کی برائیاں کرنا تنقید نگاروں کا تکیہ کلام بنا رہا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کی پیش بندی یا تقابل کاری کے بغیر نئے ادب یا نئی شاعری کا حسن اُجاگر نہیں ہوسکتا؟ اگر ایسا ہوسکتا ہے تو پھر یہ فضول قسم کے سہارے کیوں؟ بات یہ ہے کہ ترقی پسندی سے چونکہ ناقدین بیزار تھے، اس لئے خیر سے نئی شاعری کی سراہنا کے نام پر بھی انہوں نے ترقی پسند شاعری میں کیڑے نکالنے کے مضحکہ خیز راستے ڈھونڈ لئے اور انہیں یہ خیال ہی نہیں رہا کہ نئی شاعری بھی بس اسی طرح اپنے وقت کی پکار ہے جس طرح اشترا کی شاعری تھی، لہٰذا اس معاملہ میں نئی شاعری کے ساتھ ناقدین کا تجزیاتی رویہ اُسی حد تک منصفانہ کہلا سکتا ہے جس حد تک اس میں زمانے کی پکار سے ہم آہنگی دکھائی گئی ہو، اس لئے کہ فنکار کی شخصیت اور عہد کو بھلا کر فن پارے کی سچی پرکھ ہو ہی نہیں سکتی۔ (ماخوذ)

ڈاکٹر ارشاد احمد
H. No. 7131/, Amina Manzil, Islamia Nagar, Siwan-841226 (Mob.9771443219)

احسانؔ سیوانی: یادیں اور باتیں

۱۲/جون ۲۰۲۳ء کی بات ہے،احسانؔ سیوانی کے موبائل سے خبر ملی کہ ’’احسانؔ سیوانی کا آج دس بجے صبح انتقال ہوگیا‘‘ ظاہری بات ہے کہ یہ خبر احسانؔ سیوانی کی طرف سے نہیں، بلکہ ان کے اہل خانہ کی طرف سے ٹائپ شدہ تھی۔ چند گھنٹوں کے بعد جناب اشتیاق سعید کے فیس بک وال پر یہ خبر مع تصویر گشت کرنے لگی:

احسانؔ سیوانی سے ہماری ملاقات تقریباً دو عشرے قبل ہوئی تھی جب وہ ممبئی سے اپنے آبائی گاؤں موضع بہوارہ، ضلع سیوان تشریف لائے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ جب اپنے گاؤں آتے تو میرے والد وکیل احمد صاحب سے ملاقات کرنے ضرور آتے۔

میرے والد کا پیشہ درس وتدریس تھا اور احسانؔ سیوانی ان کے عزیز شاگرد تھے۔ ویسے میرے والد کے ڈھیروں شاگرد اطراف واکناف پھیلے ہوئے ہیں، لیکن ایسے شاگردوں کی تعداد کم ہے جو اس طرح کی عقیدت ومحبت سے ملنے آتے ہوں۔ اس دن سے احسانؔ سیوانی کی نیک شخصیت کا نقش میرے دل میں محفوظ ہوگیا۔ اسی دن شام کو سمیع بہواروی نے ان کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا تھا جس میں مضافات کے درجنوں شعرا کے علاوہ ادب نواز حضرات کی شمولیت رہی۔ اب احسانؔ سیوانی سے باضابطہ ربط وضبط کا سلسلہ چل پڑا۔

احسانؔ سیوانی کی پیدائش موضع بہوارہ، تھانہ بڑہریا، ضلع سیوان میں ایک متوسط کاشتکار گھرانے میں ۱۱/ جولائی 1951ء میں ہوئی۔ والد کا نام مولوی اقبال حسین اور والدہ کا اسم گرامی حدیث النسا تھا۔ کاشتکاری پر ہی خاندان کا انحصار تھا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے احسانؔ سیوانی کا داخلہ گاؤں کے مکتب میں ہوا۔

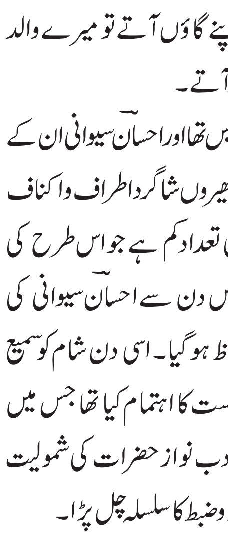

انہوں نے بڑہریا کے جی۔ایم ہائی اسکول سے ۱۹۶۸ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ڈی،اے،وی،پی،جی کالج سیوان میں داخلہ لیا۔اس وقت معروف قلم کار ڈاکٹر انورؔ سیوانی صدر شعبہ اردو فارسی کے عہدے پر فائز تھے۔احسانؔ سیوانی کو اسکول کے زمانے سے ہی شعر وسخن سے لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔کالج کا ماحول ادبی تھا۔ پروفیسر حمیدؔ تمنائی چند دنوں قبل کالج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ان کی رہنمائی میں کالج میں ملک گیر سطح پر مشاعرہ ہوتا تھا۔انورؔ سیوانی بھی اپنے دولت کدے پر ماہانہ نشست کا اہتمام کرتے تھے۔ اس میں شہر کے مبتدی اور منتہی دونوں طرح کے شعرا شریک ہوتے تھے۔ ایسے ادب ساز ماحول میں احسانؔ سیوانی کی شاعری کو جلا ملی۔ وہ انور سیوانی کے دولت کدے پر منعقد ہونے والی ماہانہ نشستوں میں شریک ہونے لگے۔ ابتدائی دور کی شاعری پر انہوں نے علی حیدر نیر اور مجنوںؔ قطبی سے اصلاح لی۔ پروفیسر حمیدؔ تمنائی سے بھی اچھے تعلقات رہے۔ یہ سلسلہ طالب علمی کے زمانے تک چلتا رہا۔ اس درمیان ان کی کئی غزلیں بہار کے اخبار ورسائل میں شائع ہوئیں، جن سے انہیں کافی حوصلہ ملا۔

تحصیل علم کے بعد احسانؔ سیوانی نے فکر معاش کے سلسلے میں ممبئی کا رخ کیا۔ ممبئی سخت آزمائشوں کا شہر ہے، لیکن احسانؔ سیوانی خوش قسمت نکلے۔ وہاں ان کے بڑے بھائی شمیم احمد پہلے سے مقیم تھے، اس لئے انہوں نے قیام وطعام کا انتظام کردیا۔ ممبئی میں کچھ دنوں تک اساڑھ کے درزی بنے رہے، لیکن تگ و دو جاری رکھی۔ آخر کار انجمن خیر الاسلام ہائی اسکول، مدن پورہ میں سائنس اور ریاضی کے استاد کی حیثیت سے بحال ہوگئے۔ خوش آئند بات یہ رہی کہ اس انجمن کے زیر اہتمام ہر سال ممبئی، ستارا، پونے اور ناسک میں مشاعرے بھی ہوتے تھے، جن میں احسانؔ سیوانی کو بطور خاص پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ ممبئی کے رنگ

بھون کا مشاعرہ کافی مقبول ومشہور تھا۔اس میں ملک گیر سطح کے بڑے بڑے شعرا شامل ہوتے تھے اور بیشتر اوقات نظامت کے فرائض کنور مہندر سنگھ بیدی انجام دیتے تھے۔ احسانؔ سیوانی کو اس مشاعرے میں بھی شرکت کا موقع ملا۔اسی طرح پونہ کے نہرو آڈیٹوریم میں منعقد ایک مشاعرے میں ان کی شرکت ہوئی جس میں ماہر اقبالیات جگن آزاد بھی موجود تھے۔اس میں احسانؔ سیوانی کا کلام خوب پسند کیا گیا۔اسے مکرر پڑھنے کی فرمائش ہوئی ۔

وہ مجھ کو بھول گئے اجنبی کی طرح
جنہیں میں ڈھونڈ تا رہتا ہوں زندگی کی طرح
کھلے ہیں پھول مگر چند ہی گھڑی کے لئے
بہار آئی ہے گلشن میں آپ ہی کی طرح
نہیں ہے کوئی بھی رشتہ مرا مگر ان سے
عجب جنون سا رہتا ہے عاشقی کی طرح

احسانؔ سیوانی کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۱۷ء میں طبع ہوا۔ مجھے یاد ہے،تب وہ گاؤں آئے تھے تو ڈاکٹر سمیع بہواردی نے اس کی رسم رونمائی اور اعزازی نشست کا اہتمام کیا تھا۔علاقے کے بیشتر قلم کار اس پروگرام میں شریک ہوئے۔احسانؔ سیوانی کو شال اوڑھا کر اور گل پوشی کر کے عزت افزائی کی گئی اور ان کے شاعرانہ انفراد پر بھی گفتگو ہوئی۔دوسرے دن میں نے انہیں اپنے غریب خانے پر آنے کی دعوت دی۔تب میں اپنے آبائی گاؤں پٹی بھلواں (بڑہریا) سے ہجرت کر کے سیوان آ گیا تھا۔اصغر علی عرف چھوٹے بھائی (مرحوم) کے ساتھ وہ سیوان آئے۔ ادب اور شاعری پر گفتگو ہوئی۔سیوان کی ادبی پیش رفت سے میں نے انہیں واقف کرایا۔ضیافت اور تصویر کشی ہوئی،مگر کون جانتا کہ یہی آخری ملاقات ثابت ہوگئی۔ وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے وہ بہت خوش ہوئے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ کم سے کم سال میں ایک بار ضرور گھر آؤں گا،مگر کووڈ کے جارحانہ حملے اور اس کے بعد ان کی خرابی صحت نے سیوان آنے کا موقع فراہم نہیں کیا،لیکن موبائل پر رابطہ بنا رہا۔

۷؍جنوری ۲۰۲۲ء کو میرے والد کا انتقال ہوا۔جب میں نے یہ خبر ان تک پہنچائی تو انہوں نے افسوس کا اظہار کیا اور مشورہ دیا کہ موصوف پر ایک سونیئر ضرور شائع کرائیں۔زندگی کی بھاگ دوڑ میں ان کی باتوں پر عمل نہیں کر سکا،لیکن وہ بھی خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے دو ماہ کے بعد مزید یاد دہانی کرائی اور یہ بتایا کہ:''میں نے اپنے استاذ محترم کی ذات وصفات پر مشتمل مضمون تیار کر لیا ہے اور آپ کے پتے پر ارسال کر آیا ہوں۔''اور واقعی سات صفحات پر مشتمل میرے والد صاحب پر ان کا پہلا تاثراتی مضمون میرے پاس آ گیا۔اب میں نے سونیئر شائع کرانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ان ہی کی تحریک کا نتیجہ ہے کہ ۱۵۰ صفحات پر محیط کتاب ''وکیل احمد: ذات وصفات'' آج تیار ہے،لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں یہ شائع نہیں ہو سکی۔

احسانؔ سیوانی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ان کا پہلا غزلیہ مجموعہ ''مٹی کی مہک'' ۲۰۱۷ء میں منظر عام پر آیا۔اس کی ابتدا حمد و

نعت سے ہوئی ہے اور ان کے علاوہ ۱۰۷ غزلیں اور چند متفرق اشعار ہیں۔شاعر کی ''اپنی بات'' کے علاوہ کمالؔ جائسی اور اشتیاق سعیدؔ کے مضامین ہیں۔غزل اردو شاعری کی محبوب ترین صنف سخن ہے۔ اردو کے بیشتر شعرا نے اپنی شاعری کا آغاز اسی صنف سے کیا ہے۔ ناقدین شعروادب کا خیال ہے کہ شعر موزوں کر لینا ہی کمال فن نہیں ہے، بلکہ شعر میں کوئی نیا خیال، اچھوتا مضمون اور فکری سطح پر جدید خیالات کا ایسا بیان ہونا چاہئے جو دل میں اتر جانے کی خاصیت رکھتا ہو۔

احسانؔ سیوانی نے اپنی شاعری کے لیے صنف غزل کو ہی پسند کیا اور پوری زندگی اس کے گیسو سنوارتے رہے۔احسانؔ سیوانی کی غزلوں میں عشقیہ مضامین کے علاوہ ایسے مضامین بھی وافر مقدار میں موجود ہیں،جن کا تعلق براہ راست زندگی اور معاشرت ہے۔انہوں نے معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان سے پیدا شدہ مختلف مسائل پر اپنی غزلوں کی محفل سجائی ہے۔کہیں کہیں ان کا لہجہ واعظانہ اور انداز خطیبانہ ہے،لیکن ان میں شدت نہیں ہے،اس لیے وہ اشعار بوجھل نہیں لگتے بلکہ پیغام رسانی کا کام کرتے ہیں۔ چونکہ احسانؔ سیوانی کا پیشہ درس وتدریس تھا،اس لیے ان کے اشعار نصیحت آمیز ہونے کے ساتھ

بصیرت افروز بھی ہیں۔ وہ صدق دل سے چاہتے ہیں کہ صالح معاشرہ ہواوراس میں سانس لینے والے افراد نیک اور ایمان دار ہوں ۔

دور رہو اے لوگو! کالے دھن سے بھی
زہریلا ہے یہ سانپوں کے پھن سے بھی

نہ اترائے کوئی اپنے عروجِ زندگانی پر
پتہ اتنا تو سب کو ہے کہ موسم بھی بدلتا ہے

مصیبتوں میں جو خود کو سنبھالتا ہی نہیں
وہ زندگی کی حقیقت کو جانتا ہی نہیں

نہ کھیلو لاشوں سے مظلومیت کی تم ورنہ
پڑے رہو گے کسی روز بے کفن تنہا

کیوں رو رہے ہیں آپ مقدر کے سامنے
تدبیر لازمی ہے ، اسے آزمایئے

احسانؔ سیوانی کا دوسرا مجموعہ کلام ''یادوں کے سائے'' ۲۰۲۱ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ یہ بھی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی ابتدا حسب روایت حمد اور نعت سے ہوئی ہے۔ اس میں کل ۱۳۵ غزلوں کے علاوہ سات نظمیں اور چند متفرق اشعار ہیں۔ ''یادوں کے سائے'' میں شامل غزلوں کے مطالعے کے بعد یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ احسانؔ سیوانی

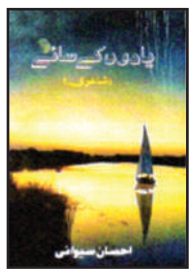

ایک پختہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ قلم کار تھے۔ مضامین کے انتخاب، اسلوب اور طرز ادا میں ان کا ذوق جمال اور فکر ونظر کا کمال واضح طور پر نظر آتا ہے۔ احسانؔ سیوانی بالیدہ ذہن اور بالغ نظر قلم کار تھے۔ ان کی فکری وفنی بلندی کا اعتراف ہم عصر ناقدین اور شعرا نے کیا ہے۔ ترنم اور میٹھی آواز فطرت کے خاص تحائف ہیں جن کے بدولت وہ سامعین کی سماعتوں کو مسرت آگیں لمحات سے ہم کنار کر دیتے تھے۔ بیشتر اوقات سامعین ان سے ترنم میں کلام سنانے کی فرمائش کرتے تھے اور وہ مشاعرہ لوٹنے کا ہنر جانتے تھے۔ بقول اشتیاق سعید:

''عید ملن مشاعرہ کی تیاری شروع ہوگئی۔ شاعروں کی فہرست مرتب ہونے لگی۔ چند احباب نے مشورہ دیا کہ فہرست میں دو ایک نام ترنم سے پڑھنے والے شعرا کا بھی شامل کیا جائے۔ عارف اعظمی نے فوراً احسانؔ سیوانی کا نام لکھوا دیا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ احسانؔ سیوانی صاحب کو نعت پاک پڑھنے کے لیے بلایا گیا۔ انہوں نے اپنی مترنم آواز کا وہ جادو جگایا کہ سامعین عش عش کر بیٹھے۔''

(مضمون ''ہوں میں خاموش تو حیرت کیا ہے۔'' اشتیاق سعید، گوشہ احسانؔ سیوانی، سہ ماہی ادب گاؤں (۱۱) ص ۹۴)

شام غم ہے کوئی یادوں کے بہانے آئے
آئے آئے کوئی پھر دل کو دکھانے آئے

ہزاروں جور وستم سے گزر کے جانا ہے
عجب حیات ہے وہ جس میں مر کے جانا ہے
کسے ہے شوق کہ دنیا کی کلفتوں سے لڑے
ملی ہے زیست تو کچھ کام کر کے جانا ہے

اے میرے خوابوں کی تعبیر بتانے والے
اب تو آجاؤ بہت دور کو جانے والے

گزر جاتا ہے ہر لمحہ بے قراری میں
الجھ کے رہ گیا ہوں میں بھی خانہ داری میں

اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ مظلوم، مقہور، خستہ حال اور سماج میں ادنیٰ حیثیت کے افراد پر کسی کی توجہ نہیں جاتی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ شان وشوکت سے زندگی گزارنے والے اور بااثر و بارسوخ افراد پر ہی زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اردو شاعری بالخصوص اردو غزل میں بھی عموماً ان موضوعات پر اشعار کی کمی دیکھی جاتی ہے۔ چند ترقی پسندوں نے مزدور مظلوم اور محکوم اقوام کی تباہ حال صورتحال کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، لیکن یہ شاعری نظم کی صورت میں ہے۔ احسانؔ سیوانی نے اس روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنی غزلوں میں غربا و مساکین، نادار اور مظلوم افراد کے لیے فکر انگیز اور قابل توجہ اشعار کہے ہیں۔ ان کے اشعار سے

ان کی قلبی، ذہنی اور فکری وابستگی کی آگہی ہوتی ہے۔ ان اشعار کا بیانیہ بھی انتہائی پراثر اور پرخلوص ہے ۔

ان خانہ بدوشوں کی طرف بھی تو نظر ہو
جیتے ہیں، مگر جینے کا سامان نہیں ہے

ہر ایک سمت ہے چرچا کہ ہم عروج پہ ہیں
تڑپ رہی ہے ، مگر زیست آب و دانے کو

خالی ہاتھ تھا مرا وہ خالی ہا تھ چلا گیا
مایوس میرے دَر سے سوالی چلا گیا

افلاس کی آنکھوں میں آنسو ہیں، زبان چپ ہے
بہتا ہوا دریا ہے خاموش کنارا ہے

احسانؔ سیوانی خاموش طبع ، وضع دار، خلیق اور ملنسار تھے۔ وہ ادب میں تشہیری مقام و مرتبے کے قائل نہیں تھے۔ ایک گفتگو میں انہوں نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ ان کی شعر فہم اہلیہ ان کی شاعری کی پہلی سامع اور ناقد ہیں۔ وہ جن غزلوں کو پسند کرتی ہیں، انہیں اپنے توسط سے رسائل میں اشاعت کے لیے بھجواتی ہیں اور شائع ہونے کے بعد احسانؔ سیوانی سے زیادہ وہ خوش ہوتی ہیں۔ یہ نصیب نصیب کی بات ہے، ورنہ زیادہ تر قلم کاروں کی بیگمات تخلیق ادب کو تضیع اوقات سمجھتی ہیں۔

بہار بالخصوص سارن کے حوالے سے شائع ہونے والے شعرا کے تذکروں میں احسانؔ سیوانی کا ذکر خیر موجود ہے۔ پروفیسر حمید تمنائی نے ۱۹۷۲ء میں ''تذکرہ سخنوران سارن'' کی تالیف کی۔ اس میں احسانؔ سیوانی کا تعارف اور دو غزلیں شامل ہیں ۔ اس وقت احسانؔ سیوانی اپنے آبائی گاؤں بھوارہ کی مناسبت سے احسانؔ بھواروی کے نام سے چھپتے تھے۔ بعد میں جب ممبئی ہجرت کی تو بھواروی کی جگہ پر سیوانی لکھنے لگے، جس وقت ''سخنوران سارن'' کی اشاعت ہوئی اس وقت ان کی عمر محض ۲۱ سال تھی اور بی۔ ایس سی کے طالب علم تھے۔ اتنی کم عمری میں بھی ان کے کلام کا رنگ وآہنگ طرز ادا اور اسلوب استادانہ معلوم ہوتا ہے ۔

دل کو مرے جلا کے بتا کیا ملا تجھے
درد جگر بڑھا کے بتا کیا ملا تجھے

تھی آرزو یہی کہ تجھے دل میں جگہ دوں
دل کو مرے جلا کے بتا کیاملا تجھے

(سخنوران سارن، ص۱۲۲)

۲۰۱۲ء میں ''تذکرہ شعرا ئے سارن'' کی اشاعت ہوئی۔ اس کے مؤلف جناب سمیع بھواروی ہیں۔ اس تذکرے میں احسانؔ سیوانی کا مفصل تعارف اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ بقول سمیع بھواروی:

''۱۹۶۸ء کے اوائل میں شعر وسخن سے رشتہ قائم ہوا۔ ابتدائی دور کی غزلوں پر پروفیسر علی حیدر نیر سے اصلاح لی۔ شعر کہنے اور کلام پڑھنے کا انداز خوب تھا۔ جلد ہی حلقہ ادب میں بحیثیت شاعر نمایاں مقام حاصل کرلیا۔''

(تذکرہ شعرائے سارن، ص ۱۷)

احسانؔ سیوانی کے پہلے مجموعہ کلام ''مٹی کی مہک'' پر بہار اردو اکادمی نے اور ''یادوں کے سائے'' پر یوپی اردو اکادمی نے انعامات دیے۔ اشتیاق سعید نے موصوف پر سہ ماہی ''ادب گاؤں'' (۱۱) کا گوشہ نکالا۔ ڈاکٹر محمد مظاہر الحق نے ان کی کتابوں پر تبصرے لکھے جو بہار کے اخبارات میں شائع ہوئے۔ ابھی مرحوم کا ادبی سفر جاری تھا۔ چار ماہ قبل سانس لینے میں ہوئی، دقت سے انہیں اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ تقریباً بیس دنوں کے بعد جب بیماری سے افاقہ ہوا تو گھر آئے اور خلق شعر کے پرانے کام میں لگ گئے۔ میں نے موبائل سے بات کی، آواز میں نقاہت موجود تھی اور رک رک کر بول رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پوری طرح صحت مند نہیں ہوئے ہیں۔ ایک دن ان کی اہلیہ نے بتایا کہ موبائل کا میسج پڑھ لیتے ہیں، لیکن جواب ٹائپ کرنے کی سکت نہیں ہے۔ قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں ایسی حالت میں ایک حساس شاعر اور فنکار کے دل پہ کیا گزرتی ہوگی۔ اللہ انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔

(سخنوران سارن، پروفیسر ایم۔ اے حمید تمنائی و زاہد فیروز پوری، ناشر، جابر فیروز پوری، سیوان ۱۹۷۲ء، تذکرہ شعرائے سارن، سمیع بھواروی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۱۲، مٹی کی مہک، احسانؔ سیوانی، نیوز ٹاؤن پبلیشرز ممبئی ۲۰۱۷، یادوں کے سائے، احسانؔ سیوانی، نیوز ٹاؤن پبلیشرز ممبئی ۲۰۲۱، سہ ماہی ''ادب گاؤں'' (۱۱) مدیر اعلیٰ اشتیاق سعید، میرا روڈ تھانے، ممبئی ۲۰۲۲ء سے اخذ واستفادہ کے ساتھ)

سلطان آزاد
"Ashiana-e-Sultan" Pannu Lane, Gulzarbagh, Patna 800007 (Mob.8789934730)

جانشین داغؔ نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی

فصیح الملک نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی اپنے دور کے استاذ شعرامیں سب سے زیادہ مشہور ومقبول ہوئے۔ ان کی زبان دانی کا شہرہ سارے جہاں میں تھااوران کی شاعری کا ڈنکا پورے برصغیر میں بج رہا تھا، جس کے باعث جوق درجوق پورے ہندوستان میں شعراان کی شاگردی اختیار کرنے میں فخر اور خوشی محسوس کرتے تھے۔ بلاشبہ داغؔ اپنی شوخ بیانی، مضمون کی نیرنگی، شگفتہ بیانی اور دہلوی ٹکسالی زبان کے استعمال میں حددرجہ امتیاز رکھتے تھے، جس کے باعث انہیں شہرت اور مقبولیت ملی۔

۱۸۵۷ء میں داغؔ نے رام پور اور حیدر آباد کا رخ کیا۔ اسی دوران میر محمد باقرؔ عظیم آبادی کی توسط سے عظیم آباد بھی آئے۔ پروفیسر ذکی الحق نے اپنے مضمون 'داغؔ اور بہار' مشمولہ مجموعہ مضامین ''ذکر و مطالعہ''، مطبوعہ ۱۹۵۹ء میں لکھا ہے:

''اب داغؔ کلکتہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ پہلے دہلی آئے پھر لکھنؤ پہنچے، کانپور، الٰہ آباد، ہوتے ہوئے عظیم آباد آئے۔ میر محمد باقرؔ عظیم آبادی تلمیذ حضرت وحیدؔ الٰہ آبادی کے گھر قیام کیا۔ عظیم آباد میں اپنے قیام کا مختصر تذکرہ خود داغؔ نے اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے مثنوی کے مطابق داغؔ نے عظیم آباد میں آٹھ دن قیام کیا۔

آٹھ دن دیکھی سیر پٹنے کی
یہ ہوئی وجہ جی اُچٹنے کی

ایک اور شعر اسی سلسلہ کا ملاحظہ ہو۔

میرؔ باقرؔ کے گھر قیام ہوا
خوب دعوت کا اہتمام ہوا

پروفیسر ذکی الحق نے اپنے مذکورہ مضمون میں مزید لکھا ہے کہ:

''حضرت داغؔ میر محمد باقرؔ عظیم آبادی کے مہمان تھے۔ داغؔ کے علاتی بھائی مرزا شاہ محمد شاغلؔ خلف مولوی، تراب علی متوطن دہلی، میر باقرؔ کے دوست اور ان کے پڑوسی تھے۔ مرزا شاغلؔ، داغؔ، کے شاگرد بھی تھے۔ وہ عرصہ تک عظیم آباد میں رہے۔ شطرنج بازی میں یگانہ روزگار تھے۔ داغؔ جس وقت دہلی سے اترے عظیم آباد کی خلقت استقبال کے لئے حاضر تھی۔ اس بھیڑ میں مرزا شاغلؔ بھی تھے۔

پیشوائی کے واسطے احباب
آئے تھے شوق دید میں بیتاب''

میر باقرؔ کے متعلق احسنؔ مارہروی کا نوٹ ملاحظہ ہو:

''سید محمد باقر متخلص بہ باقرؔ شاگرد وحیدؔ الٰہ آبادی پٹنے کے شرفا میں تھے۔ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ستار کا بہت شوق تھا۔ اچھے خوش نویس تھے اور وہ اس فن سے آگاہ تھے۔ اس ہم مذاقی نے مرزا داغؔ کو ان کا مہمان بنایا۔'' (بحوالہ مضمون داغؔ اور بہار)

مختصر یہ کہ داغؔ دہلوی ۲؍ مئی ۱۸۸۲ء کو عظیم آباد آئے اور یہیں سے یکم جون ۱۸۸۲ء کو نواب رام پور کلب علی خاں کے نام خط لکھا تھا، جس میں دو ماہ کی فرصت طلب کی تھی۔ اس طرح وہ عظیم آباد ایک ماہ سے زیادہ مقیم رہے اور جب تک وہ یہاں رہے شعری محفل کی ہما ہمی اور گہما گہمی رہی۔ میر باقرؔ عظیم آبادی کی رہائش گاہ، گرہٹہ پٹنہ سیٹی میں اُن سے ملنے والوں کا سلسلہ رہا۔ ان ہی دنوں داغؔ کے اعزاز میں سب سے پہلا مشاعرہ عظیم آباد میں ہوا، جس میں حضرت وحیدؔ الٰہ آبادی کا یہ مصرع طرح مقرر ہوا۔

ادھر آئینہ رکھا ہے ادھر وہ تن کے بیٹھے ہیں
جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا بن کے بیٹھے ہیں

داغؔ نے اس مصرع طرح پر اپنی غزل کاتب کو لکھوادی، مطلع ملاحظہ ہو

بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

یہی وہ دور تھا جب بہار بالخصوص عظیم آباد کے شعرا داغؔ دہلوی سے قریب ہوئے ان کی شہرت کے باعث بہار کے کئی شعرا ان کے حلقہ تلامذہ میں آ گئے۔ پروفیسر ذکی الحق نے اپنے مضمون ''داغؔ اور بہار'' میں چند شعرا کا مختصر تذکرہ کیا ہے ان میں نسیمؔ ہلسوی، ڈاکٹر مبارکؔ عظیم آبادی، محمد ریاض حسن خاں خیالؔ، حضرت سید شاہ حامد حسین اور جناب نظام الدین بلخی قابل ذکر ہیں، جب کہ خاکسار (سلطان آزاد) نے باضابطہ ایک طویل مضمون بعنوان ''داغؔ دہلوی اور ان کے بہاری تلامذہ'' میں داغؔ کے بیس بہاری تلامذہ کا ذکر کیا ہے اور ان کی شاعری کے جائزہ کے ساتھ نمونہ کلام بھی شامل کیا ہے۔

پیش خدمت ہے عنوان کے حوالے سے نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی، تلمیذ داغؔ دہلوی کا مختصر تعارف۔

مولانا حکیم سید شاہ محمد نذیر احسن المتخلص بہ نسیمؔ ابن حاجی حکیم سید شاہ امیر اکبر قادری کی پیدائش ۲۹ ربیع الاول بروز پنج شنبہ ۱۲۹۲ھ بمقام ہلسہ پٹنہ میں ہوئی۔ ہلسہ ضلع پٹنہ کا معروف قصبہ رہا ہے، جس کی مناسبت سے جناب نسیمؔ ہلسوی نے عظیم آبادی بھی لکھا۔ اب یہ قصبہ ہلسہ ضلع نالندہ میں شمار ہوتا ہے۔ نالندہ ضلع کی ادبی خدمات سے متعلق ڈاکٹر عشرت سلطانہ کی کتاب آئی ہے، مگر اس میں نسیمؔ ہلسوی کا تذکرہ شامل نہیں کیا گیا ہے، جب کہ وہ داغؔ کے نہ صرف شاگرد تھے بلکہ جانشیں تھے اور ایک اہم زود گو اور مشہور شاعر تھے۔

جناب نسیمؔ صاحب نے تعلیم اپنے والد سے پائی۔ عربی، فارسی، اردو میں کامل دسترس حاصل کی۔ حکمت کے علاوہ شعر و سخن کو اپنا مشغلہ بنایا۔ ان کے کلام کی شہرت کے پیش نظر نواب سلیم اللہ خاں صاحب ڈھاکہ نے انہیں اپنی کوشش سے کلکتہ بلایا اور مستقل ان سے شاگردی اختیار کی۔ کلکتہ میں ہی رنجورؔ عظیم آبادی جو اُن دنوں صدر اکزامیشن بورڈ کلکتہ تھے ان کے ساتھ مستقل اوقات گزارے۔ کلکتہ سے مراجعت وطن کی پھر نواب سعادت علی خاں سعادتؔ پیغمبر پور، دربھنگہ نے بڑی نوازش کے ساتھ آپ کو بلایا اور شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ بہت دنوں تک نسیمؔ صاحب نواب صاحب کے ساتھ رہے۔

واضح ہو کہ نواب سعادت علی خاں سعادتؔ پیغمبر پوری بھی داغؔ کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ احسنؔ مارہروی نے ''انشائے داغؔ'' کے صفحہ ۱۲۸ میں ان کے متعلق لکھا ہے:

''نسیم مرحوم ہلسہ ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے اور استاد مرحوم کے بہترین شاگردوں میں تھے''

پروفیسر ذکی الحق اپنے مضمون ''داغؔ اور بہار'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت نسیمؔ کی چند غزلیں میری نظر سے گزری ہیں۔ آپ کا کلام اپنے استاد کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ زبان کی صفائی، بیان کی شوخی محاوروں کی بے تکلفی اور شوکت الفاظ جو داغؔ اسکول کی خصوصیات ہیں، آپ کے کلام کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں۔''

نسیمؔ ہلسوی، داغؔ کے تلامذہ میں بالخصوص بہار میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ نے اپنی کتاب ''بہار میں اردو شاعری کا ارتقا'' (مطبوعہ ۱۹۹۸ء) میں لکھا ہے:

''فصیح الملک داغؔ دہلوی کا طوطی ان دنوں ہندوستان کے گوشے گوشے میں بول رہا تھا۔ غزل بھیجی اور اصلاح و مشورہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ داغؔ کے اپنے قلم سے اصلاح شدہ چند غزلیں مجھے ملیں، جن پر داغؔ نے بڑی شفقت سے کہیں کہیں ایک آدھ لفظ گھٹا بڑھا دیے ہیں۔''

کلیم احمد عاجزؔ کی اطلاع کے مطابق جناب نسیمؔ کا کل سرمایہ شاعری مطبوعہ و غیر مطبوعہ گویا تلف ہو گیا۔ تقسیم ہند کے وقت آپ کے صاحبزادگان جب پاکستان منتقل ہوئے تو سامان کی غارت گری میں نسیمؔ کا وہ بکس بھی شامل تھا، جس میں ان کے مسودات اور کچھ مطبوعات تھے، نسیمؔ کا پہلا دیوان ''موج نسیمؔ'' ان کی حیات ہی میں طبع ہو چکا تھا۔ دوسرے دیوان ''ریاض نسیمؔ'' کا مسودہ بھی مکمل ہو چکا تھا۔ ''بہار نسیمؔ'' اور ''فغان نسیمؔ'' دو مجموعوں کے مسودات مرتب ہو رہے تھے کہ نزول بلائے الٰہی ہوا۔ متفرق کلام رسالوں اور پرچوں میں چھپتا تھا۔ ایک گلدستہ ''گل تر'' جس میں ایک

طرح پر دو غزلیں تھیں، نسیمؔ نے چھپوا کر تمام شاگردان داغؔ اور دوسرے مشاہیر شعرا کی خدمت میں روانہ کی تھیں۔ اس دو غزلہ کی بڑی شہرت ہوئی۔ ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ نے لکھا ہے کہ ان کے تحقیقی کام کے دوران نسیمؔ ہلسوی کی ایک اہم غزل کاغذات کے پلندے میں دبی دبائی ملی۔ یہ غزل داغؔ کے پاس ۲۴/اکتوبر ۱۹۰۶ء کو بھیجی گئی تھی، جسے داغؔ نے کہیں ایک نقطہ کم وبیش کئے بغیر اپنے ہاتھ سے یہ لکھ کر واپس کر دیا ہے:

''سبحان اللہ کیا اچھی غزل کہی ہے مجھے بہت پسند آئی۔''

نسیمؔ ہلسوی کی اس غزل کے بارے میں کلیم احمد عاجزؔ نے تجزیاتی طور پر وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ:

''اس غزل میں داغؔ کا وہ تمام رنگ وآہنگ ملے گا جو داغؔ کی مخصوص انفرادیت میں شمار ہوتے ہیں اس کے علاوہ وہ سب کچھ بھی ملے گا جو داغؔ اسکول کے ایک عظیم آبادی شاگرد میں ملنا چاہئے یعنی کھیل کھیلنے والے ماحول میں بھی وہ داخلی نفسی تہذیب اور شرافت، وہ رند آشامی میں صوفیانہ رکھ رکھاؤ، خالص مجازی معاملہ بندی میں بھی حقیقت کی داخلی روح رواں دواں نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہلکے ہلکے درد کی کسک۔

بہت صبح سے آج مضطر ہیں ہم
نظر جانب دَر ہے ششدر ہیں ہم
ہمیں دیکھ کر لوٹ جاتے ہیں سب
تیرے بسمل اللہ اکبر ہیں ہم
نکالا عبث ذکر حور و پری
وہ کہتے ہیں ان سب سے بہتر ہیں ہم
اسے دل کا دینا ہی ہے اک ستم
ستمگر وہ کیا ہے، ستمگر ہیں ہم
قناعت سے کیوں کر نہ ہو دل غنی
کہ اس کی بدولت تونگر ہیں ہم
دہن ہیں ترے گفتگو ہے ہمیں
بتاتے ہیں باتیں سخنور ہیں ہم
نکالیں کسی ڈھب سے دربان کو
اسی فکر میں تیرے در پر ہیں ہم
وہ کہتے ہیں، کہتے ہیں سب بت ہمیں
حقیقت میں کیا کوئی پتھر ہیں ہم
سمجھتے ہیں سب ہم کو انشا نسیمؔ
سعادت علی خاں کے نوکر ہیں ہم

نسیمؔ ہلسوی کے مزید کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہے جس کا خدا حافظ کیا اس کو خطر کوئی
انسان کی کیا طاقت پہنچائے ضرر کوئی
تا کید یہ ہوتی ہے دیکھے نہ ادھر کوئی
مشتاق کی روکے سے رکتی ہے نظر کوئی
کیا جدت تازہ ہے کہتے ہیں نسیمؔ احباب
یہ ہے غزل رنگین یا ہے گل تر کوئی

دل جو لیتے ہو تو لے لو مگر اتنا کرنا
جب سنورنا اسی آئینے میں دیکھا کرنا
قیسؔ و فرہادؔ کے قصوں کی حقیقت کیا ہے
کشور عشق میں اب ذکر ہمارا کرنا
وہ جو سنتے ہوں تمہاری تو یہ سمجھاؤ نسیمؔ
چاہنے والوں کو اچھا نہیں رسوا کرنا

مشکل ہے مرا نشان ملنا
کھویا ہے کسی کی آرزو نے
الزام نہ دیں گے پاسباں کو
روکا تو ہے پاس آبرو نے
ہم مانتے ہیں تری وفا کو
سر دے ہی دیا نسیمؔ تو نے

خواب میں ایک طرحدار کو ہم نے دیکھا
مرحبا طالع بیدار کو ہم نے دیکھا

جس کو سنتے تھے دل آزار ستم گار نسیم
آج اس شوخ جفا کار کو ہم نے دیکھا

بلاشبہ جناب نسیم کا یہ انداز بیان داغ ہی کے گھرانے کا ہے اور داغ سے ہی پھیلا۔ جناب نسیم کے حلقہ تلامذہ کے متعلق ڈاکٹر کلیم احمد عاجز اپنی کتاب ''بہار میں اردو شاعری کا ارتقا'' میں لکھتے ہیں:

نسیم کے تلامذہ زیادہ تر مغربی ہند میں رہے۔ نسیم ہلسوی عظیم آبادی اندور، لکھنؤ، رامپور، امرتسر کے مشاعروں میں عزت سے بلائے جاتے۔ وہاں ان کا قیام بھی رہتا ان ہی مقامات پر لوگ آپ کے شاگرد ہوئے۔ بہار میں دربھنگہ اور مظفر پور میں کچھ تلامذہ تھے کچھ ضلع پٹنہ کے بھی تھے، جن میں صرف دو کے نام مجھے معلوم ہو سکے۔ ایک نواب سعادت علی خاں پیغمبر پوری اور دوسرے مولانا نصر الدین باقی مفتی گنجی عظیم آبادی، بنگال میں نواب ڈھاکہ آپ کے شاگرد تھے۔''

پروفیسر ذکی الحق لکھتے ہیں کہ ۱۹۱۵ء میں جب داغ کی جانشینی کا مسئلہ در پیش ہوا تو حضرت نسیم نے اپنے ایک مقطع میں سائل دہلوی کی جانشینی کا اعتراف کر لیا۔ یہ حضرت نسیم کا انکسار تھا جو اہل بہار کی خصوصیت رہی ہے، لیکن اس انکسار پر بھی مقتدر شعرا نے بہار و بنگال کے لئے آپ کو داغ کا جانشیں تصور کیا۔ اس کی سند میں دو مقتدر شعرا شاد عظیم آبادی اور رنجور عظیم آبادی کے خطوط ملاحظہ ہوں:

(۱)

''مکرمی تسلیم! عنایت نامہ نے ممنون کیا۔ عزیزی حضرت سائل مد عمرہٗ کا کیا کہنا، ان کے اخلاق کا میں کلمہ گو ہوں۔ آپ نے ایک دفعہ مجھ کو سرفراز کیا تھا اور شعر بھی سنائے تھے۔ مجھ کو یاد ہے۔ ہر چند بھی موازنہ کی لیاقت نہیں رکھتا، مگر صوبہ بہار کیا دور دور تک آپ جانشیں داغ کہے جانے کے مستحق ہیں۔ آپ کی دونوں غزلیں میں نے پڑھیں، احسنت احسنت خدا آپ کو کامیاب کرے۔''

(نامہ نگار، خاکسار، سید علی محمد شاد، حاجی گنج، پٹنہ ۴ جنوری ۱۹۱۷ء)

(۲)

کلکتہ۔ ۳ رجنوری ۱۹۱۷ء ـــــ جناب مولوی سید شاہ نذیر حسن صاحب نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی کا کلام میری نظر سے گزرتا رہا اور میں ہمیشہ اس سے مزہ لیتا رہا ہوں۔ نواب فصیح الملک داغ مرحوم کے دوسرے ارشد تلامذہ کے کلام بھی میری نظر سے گزرے ہیں اور جناب نسیم کو کسی سے کم نہیں سمجھتا اور میں زور کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر تمام ہندوستان میں نہیں تو کم از کم صوبجات بہار و بنگالہ میں تو اس امر کے مستحق ہیں کہ جانشیں حضرت داغ مانے جائیں۔'' (محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی، شمس العلما خان بہادر)

ان دو خطوط کے علاوہ دیگر اور مقتدر شعرا کے خطوط جو حضرت نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی کے بھائی جناب بشیر اکبری ابوالعلائی کے پاس تھے اور ان سے ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کو ملے تھے، ان متعدد شعرائے اردو میں اکبر الہ آبادی ڈاکٹر سر محمد اقبال، آغا شاعر قزلباش دہلوی، حضرت احسن مارہروی وغیرہ تھے۔ ان خطوط میں نسیمؔ ہلسوی کو بہار، بنگال اور اڑیسہ میں داغ دہلوی کا جانشین تسلیم کیا گیا ہے، مگر ان خطوط کے اقتباس ڈاکٹر کلیم احمد عاجز نے اپنی کتاب میں تذکرہ کے ساتھ نہیں کیا ہے۔ شاید اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

بہر صورت اردو کے مقتدر شعرا کے خطوط اور ان کے کلام سے ظاہر ہے کہ اس دور میں ان کے ہمعصر شعرا اور اساتذہ شعرا نے انہیں سراہا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ ان کی شاعری پر پورا پورا اثر داغ کا رنگ نمایاں ہے ساتھ ہی یہ بھی کہ شاعری کی بدولت آج بھی انہیں فصیح الملک حضرت داغ کا سچا جانشیں تسلیم کیا جانا چاہئے، ان کا انتقال ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء میں بہ عمر ۴۵ سال ہوا۔ ان کی رحلت کی تاریخیں ''گلدستہ جلوہ یار'' میں کثرت سے شائع ہوئیں۔ (''ذکر مطالعہ'' پروفیسر ذکی الحق، ''انشائے داغ''، احسن مارہروی ''بہار میں اردو شاعری کا ارتقا''، کلیم عاجز اور نسیمؔ ہلسوی کی کتاب ''موج نسیم''، ''گل تر'' سے خصوصی اخذ و استفادہ کے ساتھ)

❀❀❀

ظفر امام
Deptt. of Persian, Danishgah, Delhi

سوداؔ اور ان کا فارسی کلام

اٹھارہویں صدی اردو شاعری کا زریں عہد تصور کیا جاتا ہے، جن شاعروں کی بدولت اس صدی کو ایسی پہچان ملی ان میں سے ایک تھے مرزا سوداؔ۔ سوداؔ کا اصلی نام مرزا محمد رفیع اور تخلص سوداؔ تھا۔ خود سوداؔ اپنے رسالہ ''عبرت العارفین'' میں اپنا نام اس طرح لکھتے ہیں:

''بندۂ خاکسار محمد رفیع تخلص بہ سوداؔ'' (۱)

اگر چہ تمام تذکرہ نویسوں نے بھی سوداؔ کا نام اور تخلص یہی لکھا ہے، لیکن سوداؔ کے تخلص کے بارے میں محمد حسین آزاد کا خیال کچھ مختلف ہے۔ ان کے مطابق بعض کا قول ہے کہ باپ کی سوداگری کے سبب ان کا تخلص سوداؔ ہوا، لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ایشیا کے شاعر ہر ملک میں عشق کا دم بھرتے ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ یہ تخلص عشق میں سودائی بننے کا اشارہ ہو۔ سوداؔ کے والد مرزا محمد شفیع بغرض تجارت کابل سے ہندوستان آ کر دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ (۲)

تجارتی پیشہ کی بنا پر قیاس یہ ہے کہ ان کا بچپن ناز و نعم میں بسر ہوا۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ سوداؔ کے آبا و اجداد سپاہی پیشہ تھے، لیکن ان کے والد نے تجارت کو اپنا پیشہ بنایا اور ہندوستان کی آب و ہوا ان کی طبیعت کو ایسی بھا گئی کہ وہ مستقلاً یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کو تجارت میں اتنی کامیابی ملی کہ ان کا شمار دولت و ثروت کی بنا پر دہلی کے معززین میں ہوتا تھا۔ ان کی شادی نعمت خان عالی کی بیٹی نجستہ اختر سے ہوئی۔ مرزا سوداؔ ان ہی کے بطن سے ۱۷۱۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور نہ صرف یہ کہ سوداؔ

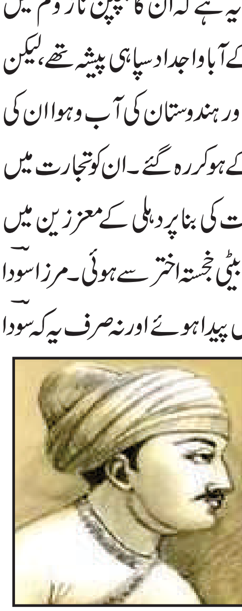

کی پرورش ناز و نعم میں ہوئی بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کا بھی بہترین بندوبست رہا۔ شیخ چاند اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ سوداؔ کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق ہوئی تھی۔ سوداؔ کا ایک شعر ہے جس میں انہوں نے اپنا وہ تعلیمی دور یاد کیا ہے جب وہ بغل میں ''گلستاں'' لئے صبح صبح مکتب جاتے تھے۔

آن بهارِ عمر کو سوداؔ بیایامی که من
صبح می رفتم سوی مکتب گلستاں در بغل

یہ بات بچپن کی تھی، مگر وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد ان کی فراخ دلی اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور یار باشی کی وجہ سے جب ان کی موروثی دولت نے بے وفا محبوب کی طرح ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو گزر اوقات کے لیے انہیں بادشاہوں اور امرا کا تقرب حاصل کرنا پڑا اور اس میں انہیں چنداں دشواری بھی نہیں ہوئی۔ یہ بیانات حکیم قدرت اللہ قاسم (۳) شیفتہؔ (۴) لالہ سری رام (۵) اور مولوی کریم الدین (۶) وغیرہ کے ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اگر چہ اپنی کتاب ''آبِ حیات'' میں لکھا ہے کہ سوداؔ کا تعلق کابل کی نسل سے تھا، ان کے باپ مرزا شیخ کابل سے تھے، بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ (۷) لیکن سوداؔ کے کلام سے ایسا تاثر ملتا ہے کہ وہ کابل کے مغلوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کابل کے نہیں ہوں گے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کا رویہ ایسا نہ ہوتا، میر علی ہاتف نے حکیم آفتاب کی ہجو لکھی تھی جس کا سوداؔ نے جواب تحریر کیا ہے اور اس میں ہاتف کو کابلی نسل کا ہونے کی وجہ سے ان کی تضحیک کی ہے۔ یہ ہجو کلیات سوداؔ میں موجود ہے اور ہجو کے اس بند سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

شیرازی تھا نہ باپ ترا اور نہ آملی
وہ خرس گر مغل کوئی ہوگا تو کابلی

نقش علی جن کا تعلق سوداؔ سے بہت گہرا تھا، انہوں نے تذکرہ میں مرزا سوداؔ کے بخارا سے ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس کی تصدیق بھگوان داس

ہندی نے اپنی کتاب ''سفینۂ ہندی'' میں بھی کیا ہے جس میں انہوں نے قبول کیا ہے کہ مرزا کے اجداد بخارا سے ہندوستان آئے تھے اور دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، لہٰذا سودا کے ہم عصروں کے اشعار کی روشنی میں سودا کے اجداد کا وطن بخارا ہی سمجھا جانا چاہئے۔

سودا کے والد مرزا شفیع تجارت میں شہرت یافتہ تھے بقول قائم انہوں نے اپنے انتقال کے وقت جو بھی ترکہ چھوڑا، سودا نے بہت جلد ہی دوست نوازی، یار باشی اور احباب پروری میں اسے ضائع کر ڈالا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے فوج میں ملازمت اختیار کر لی، مگر چونکہ وہ طبیعتاً فراخ دل تھے اور ان کے اخراجات کے مدنظر یہ ملازمت ناکافی تھی، لہٰذا وہ جلد ہی اس ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے اور مصاحبت کو ذریعہ معاش بنایا۔ یہ زمانہ سودا کے لیے نسبتاً آسودگی کا زمانہ تھا۔ خود سودا نے اپنی عیش و مستی کی طرف ایک شعر میں اشارہ کیا ہے ؂

صحبت شعر و بکف جام و صراحی در دست
اس سوا سودا کو کچھ کام نہیں دیتا ہے

اس شعر میں ''جام بکف'' اور ''صراحی در دست'' کا اشارہ اس یار پروری اور دوستی کی طرف ہے۔ (۸)

سودا کی تصانیف اور کلام کی بلندی و پختگی کے تناظر میں کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان کی تعلیم باضابطہ اور عمدگی سے ہوئی تھی۔ (۹) ان کی شاعری کے معیار اور فنی کمال سے ہویدا ہے کہ انہوں نے اپنے دور کے مروجہ علوم اور خاص طور پر فارسی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ لالہ سری رام کا بیان ہے کہ مرزا سودا کو فارسی ترکی، فارسی اور عربی پر دسترس تھی۔ (۱۰) اگر چہ سودا کے فارسی زبان پر تسلط اور ان کی استادی کا اعتراف بہت سے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، لیکن ان کی ترکی دانی کی تصدیق کے شواہد نہیں ملتے اور نہ ہی سودا کے کلام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہیں ترکی اور عربی دونوں زبانوں پر استادی حاصل تھی البتہ ان کی فارسی دانی پر کسی کو بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

مرزا سودا کے علم و فضل اور کمال فن کا اعتراف سبھی تذکرہ نویسوں نے کیا ہے، لیکن مصحفی نے انہیں کم علم والا (۱۱) لکھا ہے۔ دراصل سودا کے انتقال کے بعد مصحفی نے خواہ مخواہ انہیں حریف بنا لیا تھا۔ قاضی عبدالودود نے اپنے مقالے ''سودا اور مصحفی'' میں مصحفی کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "عبرت الغافلین" جیسے ادبی کارنامہ کے مصنف کو جاہل کہنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ ان کی شاعری کا پیمانہ اس قدر جالب ہے کہ ان کو کم علم والا سمجھنا ان کے ساتھ نہ صرف بے انصافی ہوگی بلکہ ان کے قصائد اور ہجویات میں جس طرح مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات نظم کی گئی ہیں ان سے مصحفی کے مرزا کی طرف اپنائے گئے رویہ کی تردید ہوتی ہے۔

سودا بہت ہی شگفتہ مزاج، زندہ دل انسان تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کی شخصیت میں ظرافت کا عنصر موجود تھا جس کا بیان بہت سارے تذکرہ نگاروں نے اپنے اپنے تذکرہ میں کیا ہے، تذکرہ نگاروں کے بیان کردہ لطائف سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک سودا دہلی میں رہے، ان کی ظرافت مہذب انداز کی تھی، لیکن جب وہ نواب آصف الدولہ کے دربار سے منسلک ہو گئے تو اودھ کے ماحول اور آصف الدولہ کے مزاج نے ان کی ظرافت میں ابتذال لا دیا، لیکن بااین ہمہ، سودا کے مزاج میں ظرافت کا مادہ جو فطری طور پر موجود تھا اس کی جھلک ان محفلوں سے ہو جاتی ہے جس میں وہ خود شرکت کرتے تھے۔ وہ اپنے طرز بیان، زندہ دلی، بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کی وجہ سے محفل کی جان اور اہل محفل کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے، انہیں بھی اپنی ان خصوصیات کا احساس تھا جو ان کی طبیعت میں ودیعت تھی۔ انہوں نے خود اپنی اس خوبی کا جا بجا اقرار کیا ہے ؂

ہر بات ہے لطیفہ و ہر اک سخن ہے رمز
ہر آن ہے کنایہ وہ ہر دم ٹھٹھولیاں

سودا کی زندگی کا ایک بڑا واقعہ وہ ہے جب عماد الملک (۱۲) پر افتاد پڑی اور قصہ مختصر سودا کو دہلی چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بقول جمیل جالبی:

> ''سودا ۱۱۷۳ھ تک دہلی میں رہے، لیکن ۱۱۷۳ھ میں عالمگیر ثانی کے قتل کی خبر ملنے کے بعد احمد شاہ ابدالی کے دہلی آنے کی خبر گرم ہوئی اور عماد الملک دہلی چھوڑ کر سورج مل جاٹ کے پاس چلا گیا تو سودا بھی اس کے ساتھ چلے گئے۔ عماد الملک اس وقت ملکی سیاست سے

الگ ہوکر ایک طرح سے جلاوطن کی زندگی گزار رہا تھا اور سوؔدا کی مصاحبت اور اپنے علم وادب کا شوق پورا کرنے کے لیے اس کے پاس وقت تھا۔ ۱۱۷۶ میں جب نواب شجاع الدولہ نے شاہ عالم کو ساتھ لے کر فرخ آباد پر حملہ کیا اور احمد خان بنگش نے عماد الملک کو مدد کے لیے خط لکھا (اس وقت عماد الملک سورج مل جاٹ کے پاس مقیم تھے) تو سوؔدا عماد الملک کے ساتھ فراخ آباد پہنچے اور وہاں مہربان خاں رنؔد نے عماد الملک سے سوؔدا کو مانگ لیا۔''(۱۳)

سوؔدا کی ۱۱۷۶ھ میں فرخ آباد میں موجودگی کی شہادت یہ بھی ہے کہ سوؔدا نے مہربان خاں رنؔد کی شادی کا جو قطعہ تہنیت لکھا ہے اس کے مادۂ تاریخ سے بھی ۱۱۷۶ھ ہی برآمد ہوتا ہے۔ قطعہ کے آخری دو شعر یہ ہیں ؎

جب اس شادی کو اس شاعر نے دیکھا
جہاں میں وہ جو ہے رشک انوری کا
کہی اے مہرباں صاحب یہ تاریخ
ہوا ہے وصل ماہ و مشتری کا

چنانچہ قائمؔ لکھتے ہیں:

''مرزا رفیع سوؔدا وزیر الممالک نواب غازی الدین خاں عماد الملک کے ساتھ فرخ آباد پہنچے، نواب مہربان خاں رند نے عماد الملک سے درخواست کی اور سوؔدا کو اپنی مصاحبت میں لے لیا۔''(۱۴)

مہربان خاں رنؔد جو احمد بنگش کے دیوانے تھے نہایت ہی احباب پرور، نیک طبیعت اور فراخ دل انسان تھے۔ سوؔدا ان کے دربار سے دس سال تک منسلک رہے۔ سوؔدا ۴ رجب ۱۱۹۵ھ مطابق ۲۷ جون ۱۷۸۱ء کو لکھنؤ میں رحلت فرما گئے۔ گویا دہلی سے طلوع ہونے والا یہ ستارہ ۷۷ سال بعد لکھنؤ میں غروب ہوگیا۔

سوؔدا نے آغاز زندگی میں فارسی میں شعر گوئی شروع کی تھی، لیکن بعد میں خان آرزؔو کے تشویق پر ریختہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ عاشقؔ عظیم آبادی نے تحریر فرمایا ہے کہ:

''موزونیت طبع کی وجہ سے ابتدا میں نظم فارسی کی طرف راغب تھا اور سراج الدین خاں آرزؔو سے صلاح لیتا تھا، خان آرزؔو نے فرمایا کہ پایۂ کلام فارسی بہت بلند ہے اور ہماری تمہاری زبان ہندی ہے۔ اگرچہ ہندیوں نے فارسی دانی کو بہت اونچے درجے پر پہنچا دیا ہے، لیکن استادان سلف اور ایرانیوں کے مقابلے میں کہ یہ ان کی اپنی زبان ہے، سورج کے آگے چراغ کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور ریختہ گوئی میں اس وقت کوئی شخص مشہور نہیں ہوا ہے، لہٰذا اگر اس زبان میں مشق سخن کریں تو فیضان طبیعت کے باعث اس دیار کے اساتذہ میں شمار ہو جائیں۔ چونکہ مشورہ نیک تھا۔ پسند آیا اور اسی روز سے ریختہ کے استاد بن گئے۔ زبان دانی ریختہ کے بانی مبانی قرار پائے اور ہندوستان کے تمام ریختہ گوشعرا انہیں اس فن کا امام اور پیغمبر سمجھتے تھے۔''(۱۵)

محمد حسین آزاد نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے اور اپنی کتاب ''آب حیات'' کے صفحہ نمبر ۵۵ میں خان آرزو کے اس نیک مشورہ کا ذکر کیا ہے۔

جیسا کہ قبل ذکر کیا جاچکا ہے، محمد رفیع سوؔدا کا تعلق اس دور سے ہے جب کہ اٹھارہویں صدی کے انقلابِ لسانی سے اردو شعروسخن کا ذوق عام ہو چکا تھا، لیکن شمالی ہند میں اردو کے ساتھ فارسی شعروسخن کا ذوق باقی تھا۔ انہوں نے ایسے ماحول میں شاعری شروع کی اور فارسی میں انہوں نے قصیدہ، قطعہ، مخمسات اور غزلیات کی اصناف پر طبع آزمائی کی، لیکن غزل گوئی سے ان کا فطری لگاؤ تھا اور اسی صنف سخن میں جوہر دکھایا ہے۔ فارسی میں ان کا ایک مختصر دیوان ہے جس میں باسٹھ غزلیات، ایک قصیدہ، چند قطعات ومخمسات شامل ہیں ان کا یہ فارسی دیوان ان کے کلیات اردو میں منسلک ہے، جو مطبع نامی نولکشور کانپور سے شائع ہوا ہے۔

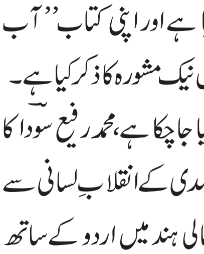

سوؔدا کو فارسی زبان پر پورا عبور اور فارسی گوئی میں پورا انہاک

تھا۔ان کی فارسی دانی کا اندازہ فارسی نثر میں ان کے مشہور رسالہ ''عبرت الغافلین'' کے مطالعہ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔اس رسالہ سے ان کی فارسی دانی کے علاوہ ان کے نظریۂ تنقید کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے اوراس سے فارسی میں تنقید کی راہ ہموار ہوتی ہے۔بقول مولانا محمد حسین آزاد کے لفظوں میں:

''رسالہ عبرت الغافلین طبع شاعر کے لیے سیڑھی کا کام دیتا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا طبعی شاعر ہی نہ تھے بلکہ اس فن کے اصول وفروع میں ماہر تھے۔اس کی فارسی عبارت بھی زبان دانی کے ساتھ ان کی شگفتگی اور شوخیٔ طبع کا نمونہ ہے۔''(۱۶)

سوداؔ کی فارسی شاعری میں مضامین غزل تصورِ حسن وعشق تشبیہات و استعارات وجذبات وخیالات وہی ہیں جو عام طور پر فارسی شاعروں میں صدیوں سے رائج ہیں،اردو قصائد میں جو مقام سوداؔ کا ہے وہ فارسی میں نہیں،لیکن بات اگران کی فارسی غزلوں کی ہو تو اس میں دورائے نہیں کہ ان کی فارسی غزلیں اردو سے بہتر ہیں۔

ان کا فارسی کلام ان کی زندگی کے اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب جذبات میں گرمی،خیالات میں رفعت اور دل میں اُمنگ ہوتی ہے اورشاعری جذب وکیف کے ساتھ دلی جذبات کے اظہار کا مؤثر ذریعہ اور جذبات دل کی بہترین ترجمان ہوجاتی ہے۔سوداؔ کے یہاں خیالات کے اظہار کے لیے مؤثر لہجہ اور جذبات کی ترجمانی کے لیے الفاظ کا انتخاب،زبان کی سلاست اور شستگی اور شیریں بیانی ہر جگہ نظر آتی ہے وصال وفراق کی حکایتیں،جام وسبو کی کھنک،واعظ وزاہد سے چھیڑ چھاڑ وغیرہ کے مضامین سے ان کا ایوان غزل پوری طرح مرصع ہے ۔

دل دارم و جان دارم و دین دارم و ایمان
ازمن بستان آنچه که درکار تو باشد

یہاں سوداؔ کا عاشقانہ جذبہ فدویت ظاہر ہے۔بلاشبہ سوداؔ نے اپنے فارسی کلام میں عشق کی مختلف کیفیات کا اظہار نہایت مؤثر انداز میں کیا ہے ۔

از دلم چون آه آتش ناك می آید برون
دود از هريك خس وخاشاك می آيد برون
می برآید آن چنان کلبۂ احزان من
چون زچشم خسته جان پاك می آيد برون
طاقت صبر و تحمل را تغافل می برد
جان زتن زان غمزۂ فتراك می آيد برون
اشك را نسبت نه باشد هيچ باچشم صدف
این گهر از ديدۂ نم ناك می آيد برون (۱۷)

نظیرؔ کی طرح ناصح کی نصیحت پر طنز لطیف اوراس کے لیے ''مرد سادہ'' کے استعارہ کا استعمال ان کے یہاں بخوبی پایا جاتا ہے ۔

ناصح از راه کرم ما را نصیحت می کند
جز شنیدن هيچ نتوان گفت مرد ساده را (۱۸)

سوداؔ کے فارسی کلام کی خصوصیات میں تغزل کے عناصر کے علاوہ شوخی و شگفتگی،صبر وقناعت وتصوف کے مضامین میں بھی پائے جاتے ہیں ۔

وای بر زاهد که صائم ماند در فصل بهار
ای خوشا رندی که او ساغر بزير تاك زد

راضیم گر چرخ زیر تيغ بنشاند مرا
از برای سر پئی سامان بگردم تاکجا
جز نمك پاشی بخاطر ره نمی یابد علاج
بر جراحتهای تيغ عشق مرهم تاکجا

سوداؔ کی شاعری میں حرص دنیا سے منھ موڑنا اور ان کی پیرانہ سالی کی غیرت بھی نمایاں ہے ۔

افسوس پای عيش جهان را قيام نيست
جز گردش زمانه دریں بزم جام نيست
همت فقرم نخواهد شاهئ نا پائیدار
زين كلاه سر حباب آسا بنازم تا كجا

سوداؔ کے کلام میں شوق مے کشی کی جھلک دکھائی دیتی ہے جس سے والہانہ سرمستی اور رندانہ سرشاریت کا اظہار تو نہیں ہوتا،لیکن صہبا گساری سے انہیں پاک نہیں کہا جاسکتا۔ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مئے کے قدرداں اورلذت شناس ہیں اورحرم سے زیادہ میخانہ کو پرسکون اورکشادہ قرار دیتے ہیں اور دعوت ناؤنوش کے بھی خواہاں ہیں ۔

در میکدۂ ما چو رسیدی ز حرم باش
این خانه چون آن خانه تنگ نیست تو هم باش
در محفل مستان به ازین پیش کشی نیست
یك جام بگیر از من وهم پهلوئ جم باش (۱۹)

مرزا محمد رفیع سوؔدا کے فارسی کلام میں تصوف کا عنصر نمایاں ہے ظاہر ہے وہ خود صوفی شاعر نہیں تھے، اس لئے خیال تصوف بس اتنا ہی ہے جتنا عمومیت سے غزل میں ہوتا ہے۔

در کعبه یهودیم ومسلمان بدر دیر
آرام بجز خانۂ خُمار نداریم

هرگز نمی رود زتنش تاکه جان رود
عاشق کجا زکوی تو ای مهربان رود

آزادگی با من اسیری نمی رسد
در گوشۂ قفس خطره وخوف دام نیست

سوؔدا کی زندگی کا بیشتر حصہ دربار سے منسلک رہا ہے، مگر یہ باعث حیرت ہے کہ ان کے یہاں حصول جاہ حشم کے لئے عموماً ثنا گستری کے مضامین نہیں ملتے بلکہ اس کے برعکس انہوں نے اپنے فارسی کلام میں قناعت اور بے ثباتی دنیا کا مضمون اپنے پورے وقار کے ساتھ باندھا ہے۔

سوؔدا کے فارسی کلام پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ الفاظ کے لامحدود ذخیرہ پر انہیں مکمل قدرت حاصل ہے اور ایسا لگتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں۔ ان کی اختراع کردہ تراکیب اور بندشوں کی کرشمہ سازیاں دامان دیدہ ودل کو ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے اور دراصل اسی میں ان کے کلام کا حسن پوشیدہ ہے۔

حواشی

(۱) کلیات سوؔدا، نول کشور ۱۹۳۲، ج ۲ ص ۲۷۷
(۲) آبِ حیات، ص ۱۴۱
(۳) مجموعہ نغز، مقدمہ شیرانی، لاہور، ۱۹۳۲، ج، ص ۳۰۴
(۴) گلشن بے خار، ص ۹۹
(۵) خم خانۂ جاوید، ج ۴، ص ۱۳۷
(۶) طبقات الشعرائے ہند، ص ۱۰۳
(۷) آبِ حیات، ص ۱۴۱
(۸) باغ معانی، ص ۱۴۱
(۹) سوؔدا، ص ۳۶
(۱۰) خم خانۂ جاوید، ج ۴، ص ۳۶۴
(۱۱) عقد ثریا، ص ۳۳
(۱۲) تاریخ ادب اردو، ج، ص ۵۷۔۶۵۶
(۱۳) مخزن نکات، ص ۵۵ (ترجمہ)
(۱۴) تذکرہ ہندی، ص ۱۲۶
(۱۵) نشتر عشق، قلمی، بحوالہ دستور الفصاحت، مقدمہ ص ۱۵
(۱۶) آبِ حیات محمد حسین آزاد، شاہی پریس لکھنؤ، ص ۲۰۱
(۱۷) کلیاتِ سوؔدا، ڈاکٹر امرت لعل عشرت، مطبوعہ الہ آباد
(۱۸) کلیات سوؔدا، مطبع نامی نولکشور کانپور، ۱۹۳۲ء، ص ۲۴۶، ص ۳۷۴
(۱۹) کلیات سوؔدا، ڈاکٹر امرت لعل عشرت، ص ۳۶۹

❁❁❁

نہایت ضروری

☆ قلم کار حضرات! ''زبان وادب'' کو تخلیقات سے نوازنے کا شکریہ! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اس لئے آپ تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code بھی تحریر کریں۔ آپ کا موبائیل نمبر اور مکمل پتہ بھی ضروری ہے۔ یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔

☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں۔ بسا اوقات تخلیق کار نام بھی منسلک نہیں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی اشاعت ممکن نہیں ہو پاتی۔ ازراہ کرم ان گزارشوں پر لازماً توجہ رکھیں۔

☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔ شکریہ!

عظیم انصاری

"Rahman Manzil" 20/2, B.P.Road, B.L.No.5 Po Jagatdal, Dist. 24 Parganas (N)WB 743125

فراغ روہوی کی غزل گوئی

اردوغزل کی روایت صدیوں پرانی ہے۔حدیث دلبری سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہوئے آج اردوغزل زندگی کے تمام عوامل کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ یہ میر کے درد وغم میں ڈوب کر نکلی تو غالب کی فکری گہرائی میں ڈوبتی نظر آئی۔ مومن اور ذوق کے عشقیہ مضامین سے اپنا سلسلہ بڑھاتے ہوئے داغ کے کھلم کھلا معاملات تک آ گئی، لیکن اپنے بانکپن میں ذرا بھی کمی نہیں آنے دی۔ اقبال نے اسے فلسفیانہ اظہار خیال کا اعلیٰ نمونہ بنایا، ترقی پسند تحریک اسے عوام تک لے گئی، حلقہ ارباب ذوق نے اس کو نیا رخ عطا کیا اور جدیدیت نے اسے علامت کا گنجینہ بنا دیا، لیکن اس عوامی دور میں اسے بعض لوگوں نے مردود صنف بھی قرار دیا۔ ان حالات میں اصغر، یگانہ، جگر نے اسے ایک بار پھر قبولیت عام کے درجے تک پہنچایا۔ اس درمیان نیا کہنے کے جنون میں کچھ شعرا حد فاصل سے گزرنے کی کوشش کرتے نظر آئے، لیکن آخر کار انہیں کلاسیکی رچاؤ کی اہمیت کا احساس ہوا اور وہ مابعد جدیدیت سے نکل کر روایت کو برقرار رکھتے ہوئے غزلیں کہنے لگے اور یہ لہجہ قارئین یا سامعین کو راس آ گیا اور آج جدید غزلیں عوام میں اتنی ہی مقبول ہیں جتنی پہلے ہوا کرتی تھیں۔ بقول ڈاکٹر معید رشیدی:

> ''غزل کی شاعری میں موضوعات کا اختصاص قائم کرنا مشکل ہے۔ مجموعی طور پر جدید غزل کو کلاسیکی غزل سے مختلف کرنے کا جواز ہے، لیکن جدیدیت غزل کے امتیازات کو کلاسیکی غزل سے یکسر قلم کر دینا مناسب نہیں۔ شعر وادب میں یکسر قلم کر دینے کی ہر کوشش ناکام ٹھہرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابہام گوئی کے رجحان سے لے کر مابعد جدید رویے تک، ہر رجحان، تصور اور رویے کی چمک آج بھی موجود ہے۔ یعنی کوئی تصور پرانا تو ہو سکتا ہے۔ ختم نہیں ہو سکتا۔'' (تحریر، ص ۲۷)

آج کی غزلیہ شاعری کا ایک اہم نام فراغ روہوی ہے۔ ان کی غزلیں ہندو پاک کے علاوہ دنیا کے تمام اہم ادبی رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو دنیا ان کے نام سے اچھی طرح واقف ہے، ہمارے زمانے کی جب غزلیہ شاعری کی بات ہوتی ہے تو مغربی بنگال سے ان کا نام حوالے کے طور پر لیا جاتا ہے جو ایک بڑی بات ہے۔ مشہور مغنی جگجیت سنگھ نے اپنے کیسٹ ''ہوپ'' میں ان کی غزلیں پیش کر کے ان کے نام کی رسائی عام لوگوں تک کر دی۔ ان کی شاعری سے متعلق معروف افسانہ نگار، مترجم اور ناول نویس شبیر احمد کا کہنا ہے:

> ''فراغ روہوی گزشتہ تیس برسوں سے اردو شاعری کی زلفیں سنوار رہے ہیں۔ غزل ہی ان کی اصل معشوق رہی ہے۔ ویسے وہ اِدھر اُدھر تاک جھانک کرتے رہے ہیں۔ کبھی کن انکھیوں سے ماہیے کا بانکپن دیکھا تو کبھی بیتاب ہو کر رباعی کا زور شباب۔ کہیں نظریں بچا کر دوہے کا جوبن دیکھا تو کہیں کہہ مکرنی کی انگڑائی۔ ہائیکو تک کو نہیں چھوڑا، لیکن اب تک زندگی غزل کے ساتھ ہی نباہی۔ کمبخت ہے ہی ایسی صنف کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔''

فراغ روہوی کی اگرچہ مختلف اصناف میں کئی کتابیں شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں، لیکن میں یہاں صرف ان کی غزلیہ شاعری کے مجموعوں

''ذرا انتظار کر'' (۲۰۰۲ء) اور ''درِ خواب پہ دستک'' (۲۰۱۵ء) کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہوں گا۔ فراغ روہوی کی غزلیہ شاعری ان کی بالغ نظری کی عمدہ مثال

ہے۔ ان کی غزلوں میں فکری رچاؤ اور تہذیب کاری ہے۔ نئی نسل کا شاعر ہونے کے باوجود انہوں نے روایت کی پاسداری بھی کی ہے اور نئے لب ولہجہ کے حسن کو برقرار بھی رکھا ہے۔ خدائے سخن میرؔ سے متاثر ہیں، لہٰذا زمانے کے مزاج داں ہونے کا ثبوت بھی ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہمارے معاشرتی نظام کو واضح کرنے کے لیے وہ ثقیل الفاظ کا سہارا نہیں لیتے بلکہ آسان لفظیات سے محسوسات کو غزل کے سانچے میں ڈھالتے ہیں، مگر کمال یہ ہے کہ اپنے انفرادی لہجے کو مجروح نہیں ہونے دیتے ۔

تدبیر کارگر نہ ہوئی ورنہ دوستو
لکھا مرے نصیب کا ہرگز برا نہ تھا

جس سمت جا کے لوگ کبھی لوٹتے نہیں
دل کہہ رہا ہے آج اُدھر جانا چاہئے

مانگا کبھی بچپن میں جو مٹی کا کھلونا
تصویر کھلونوں کی دکھادی گئی مجھے

جس سمت ہیں سب محو سفر تیز روی سے
اس سمت خسارہ ہی خسارہ ہے ادھر آ

ہم سے تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا جاتا
دشت وحشت میں بھی آداب لیے پھرتے ہیں

دن نکلتے ہی جو پھل پھول رہی تھی مجھ میں
ہے زمیں بوس وہی شاخ اَنا شام کے بعد

ہم اپنی پیاس لیے کیا گئے سمندر تک
کہ وہ بھی ہاتھ پسارے ہوئے ہمیں سے ملا

غزل ایسی صنف سخن ہے جس میں ''واہ'' کے ساتھ ''آہ'' بھی ہے، مگر یہ دونوں کیفیتیں جداگانہ لطف رکھتی ہیں۔ فراغؔ روہوی کے یہاں بھی یہ کیفیتیں نمایاں ہیں چوں کہ وہ میرتقی میرؔ سے متاثر ہیں، لہٰذا ان کی غزلیہ شاعری میں بھی آہ نظر آتی ہے، لیکن جدید لب لہجہ میں اس کا مزہ کچھ اور ہی ہے۔

تم نے تو شہر گل میں گزاری ہے زندگی
موقع ملے تو موسم صحرا بھی دیکھنا

ہجراں نصیب چشم کو ملحوظ ہے وقار
آنسو چھپائے جاتی ہے اسرار کی طرح

آنکھوں پہ گراں بار ہیں جب دن کے مناظر
کیا دل کو سکوں شام کے منظر میں ملے گا

ابھی تھمی بھی نہ تھیں سسکیاں کہ رات گئے
کسی کی چیخ نے پھر رکھ دیا ہلا کے مجھے

کس لیے کریں ہجرت اپنے شہر سے آخر
اس زمین کا ہر خطہ بے اماں نہیں ہے کیا

جس غم پہ نہ ٹھہریں کبھی دنیا کی نگاہیں
اس غم کے طلب گار رہیں میرؔ بھی، ہم بھی

شعور کی بالیدگی اشعار کو بامعنی بنانے میں بہت حد تک معاون ہوتی ہے، لیکن اس میں تجربات ومشاہدات شامل ہوں تو کیا کہنے۔ فراغؔ روہوی کی غزلوں میں ان تمام کوائف کے ساتھ ساتھ گرد وپیش کی سیاسی وسماجی زندگی کا اظہار بھی ملتا ہے۔ یہی سب ہے کہ ان کی شاعری میں تاثیر اور شگفتگی کے عمدہ نمونوں کی کوئی کمی نظر نہیں آتی ۔

ہم تو انسان ہیں، اوقات ہماری کیا ہے
سنگ لوگوں نے اٹھائے ہیں پیمبر کی طرف

کہہ کر خزاں گئی تھی کہ آئے گی رُت نئی
پھر کیوں ہے آج زرد لباسی ہر ایک سمت

یہ تجربہ ہوا ہے ہمیں خواب دیکھ کر
سب کچھ ہمارے بس میں ہے تعبیر کے سوا

حد سے آگے جو پرندے نہیں اُڑنے والے
حادثے ان کو بھی شہباز کئے دیتے ہیں

سیراب پھر بھی ہوتی نہیں وادئی ہوس
ابر کرم تو کھل کے برستا ہے آج بھی

جائیں تو کہاں جائیں اماں ڈھونڈنے والے
انساں پہ زمیں تنگ یہاں بھی ہے، وہاں بھی

یہ کم نہیں کہ زمانے میں بے ضمیری کے
کس طرح تو سلامت ضمیر ہے مجھ میں

سلگ رہا ہوں میں صدیوں سے ریت کی صورت
کبھی تو مجھ کو بھی آب رواں تلاش کرے

زبان وادب میں شاعری زبردست وسیلہ اظہار ہے۔الفاظ جہاں ربط و ترسیل کا کام کرتے ہیں وہیں ان کا فنکارانہ استعمال فکرو معنی کے ایک نئے جہاں سے روشناس کراتا ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، بالغ نظر شاعر تو استعارے کی مدد سے اپنی شاعری کو مزید حسن بخش دیتا ہے۔ایک ہی استعارے کو کئی معنوں میں استعمال ہوتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ فراغ روہوی کے یہاں بھی علامات واستعارات کا فنکارانہ استعمال ملتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار کے حوالے میں آتے ہیں۔مثال کے طور پر یہ خوبصورت اشعار دیکھیں۔

کھلی جو وقت کی مٹھی تو خوشبوؤں کی طرح
فضا میں میں نے بکھر کر سکون پایا ہے

سنبھال لیں گے تمہیں، جب ہوا گرادے گی
زمین والوں کا اتنا تو آسرا رکھنا

شعلوں نے بدل ڈالی ہے رنگت مرے گھر کی
اب خواہش تزئین دَر و بام کسے ہے

نئی زمین ، نئے آسماں کا خواب لیے
بھٹک رہا ہے جو مدت سے ، قافلہ ہے وہی

زباں سے کچھ نہیں کہتی ہماری زندگی ، لیکن
ہم اس کے چہرے پہ حرف شکایت دیکھ لیتے ہیں

جسے تناؤ کی شدت سے ہم کنار کیا
اسی کمان کا پیوست تیر ہے مجھ میں

آذر تو ہے شمار میں لیکن میری طرح
کوئی تو شہر سنگ میں شیشہ گری کرے

قدیم و جدید اصناف شاعری کا فن کار

فراغ روہوی ۱۶، اکتوبر ۱۹۵۶ء کو موضع روہ، نالندہ میں پیدا ہوئے اور ۱۳ جولائی ۲۰۲۰ء کو انہوں نے وفات پائی۔ان کا اصل نام محمد علی صدیقی ابن محمد انعام الحق صدیقی تھا۔ان کی شاعری کا سال آغاز ۱۹۸۵ء ہے۔ انہوں نے پہلے جناب بازغ بہاری کو اپنا کلام دکھایا اور پھر انہیں کے مشورے سے حضرت قیصر شمیم سے مستقل شرف تلمذ حاصل کیا اور اپنے تمام تر تجارتی مشاغل کے باوجود شعروشاعری سے ہمیشہ ہی اپنا رشتہ تروتازہ رکھا اور ادبی وشعری حلقہ میں اپنا خاص مقام بنایا۔۱۹۸۰ء کے بعد کی ادبی نسل سے تعلق رکھنے والے جناب فراغ روہوی اگر چہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں، لیکن ان کا اختصاص وانفراد یہ ہے کہ قدیم اصناف سخن کے شانہ بہ شانہ انہوں نے جدید اصناف شاعری پر بھی کامیاب طبع آزمائی سے اپنی روشن پہچان بنائی ہے۔ان کے ماہیوں کا مجموعہ ''چھیاں چھیاں'' ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آیا اس کے بعد ۲۰۰۲ء میں غزلوں کا مجموعہ ''ذرا انتظار کر'' اور ۲۰۰۳ء میں نعتیہ مجموعہ ''میرا آئینہ مدینہ'' شائع ہوا۔علاوہ ازیں ۲۰۱۳ء میں رباعیوں کے مجموعہ ''جنونِ خواب'' اور ۲۰۱۵ء میں غزلوں کے دوسرے مجموعہ ''درخواب پہ دستک'' کی اشاعت ہوئی اور ۲۰۱۵ء میں ہی دوہے کا مجموعہ ''دوہا درپن'' قارئین تک پہنچا۔ ۲۰۱۶ء میں ''تو کہاں، میں کہاں'' کے نام سے حمدیہ مجموعہ طبع ہوا۔۱۱۲ صفحات پر مشتمل اس مجموعہ کی ابتدا میں چند غیر منقوط حمد اور آخری حصے میں حمدیہ

فراغؔ روہوی نے عشقیہ مضامین بھی قلم بند کئے ہیں، لیکن اس سلیقے اور ندرت خیالی کے ساتھ کہ بلاغت کا حق ادا ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے کلاسیکی رچاؤ کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے لہجے کو تراشا بھی ہے اور یہی ان کی فکری پختگی کی دلیل بھی ہے ؎

ایک تو ہجر کی شب ، اس پہ تصور اس کا
رات بھر جاگتے رہنا مرا واجب تھا میاں

میں اس کے نام پہلے بھی لکھتا تھا خط ،مگر
کاغذ تو اس طرح سے کبھی بھیگتا نہ تھا

نہ جانے کیسا سمندر ہے عشق کا جس میں
کسی کو دیکھا نہیں ڈوب کے اُبھرتے ہوئے

محفوظ علاقہ ہے یہی ایک مرا دل
جنگل نہ سمندر نہ ہمالہ ہے ادھر آ

مہکتی زلف کا سایہ متاع زخم جگر
ہمیں تو جو بھی ملا شہر دل نشیں سے ملا

کوئی چہرہ ترے چہرے کا بدل ہو کیسے
ہر غزل تری طرح جان غزل ہو کیسے

مختصر یہ کہ فراغؔ روہوی کی غزلیہ شاعری میں انفرادیت ہے۔ وہ ثقیل الفاظ کا استعمال نہیں کرتے ان کا انداز بیان سہل ہے اور زبان رواں دواں ہے۔ لفظیات کا دائرہ اگر وسیع نہیں ہے تو تنگ بھی نہیں ہے۔ زندگی کی دھڑکنیں ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری میں تشنگی حیات کی بازگشت بھی ہے اور تلخی حالات کا تذکرہ بھی۔ انہوں نے تخلیقی سفر میں تجربات اور مشاہدات کو بحسن وخوبی اپنا وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ پامال مضامین کو بھی سلیقے سے برتا ہے یعنی اپنے فکری شعور سے نیا لہجہ عطا کیا ہے۔ جدید لہجے کو اپنایا ضرور ہے، لیکن روایت کی پاسداری بھی کی ہے۔ یہ توازن برقرار رکھنا ان کی فنکاری کی دلیل ہے، اس لیے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انہوں نے ندرت خیالی کے ساتھ غزل کے رموز اور اس کے مخصوص لب و لہجے کا بھی پاس رکھا ہے اور یہی وہ وصف ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔

❀❀❀

رباعی، حمدیہ دوہے، حمدیہ ماہئے اور حمدیہ ہائیکو بھی شامل ہیں۔ اس خوبصورت حمدیہ مجموعے سے ماخوذ جناب فراغؔ روہوی کا چند غیر منقوط شعر دیکھئے ؎

وہی رحم و کرم والا ، اُسی کی　　عطا کا سلسلہ ہے عکس در عکس
صدی ہے اُسی کی ، ہے لمحہ اُسی کا　　سحر در سحر ہے حوالہ اُسی کا
اک وہی ہے کہ ہر گھڑی ، ہر دم　　دُکھ کے ماروں کو آسرا دے ہے

فراغؔ روہوی کی کہہ مکرنیوں کے مجموعہ ''بوجھ ری سکھی بوجھ'' کی اشاعت ۲۰۱۷ء میں ہوئی اور اسی سال پانچ سو سے زیادہ ہائیکو پر محتوی مجموعہ ''ہاتھ نہ جل جائے'' اور ماہیوں کے دوسرے مجموعہ ''ہم رنگ غزل چہرہ'' کی اشاعت بھی عمل میں آئی۔ مذکورہ تصانیف پر مستزاد جناب فراغؔ روہوی کی آخری کتاب ''حمد کا عالمی انتخاب'' بھی اشاعت یافتہ ہے۔ فراغؔ روہوی نے صرف بڑوں کے لئے ہی نہیں لکھا بلکہ بچوں کے لئے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ بچوں کے لئے ان کی منظوم کتاب ''جب ہم بھی بڑے ہو جائیں گے'' ۲۰۰۴ء میں اور ''ہم بچے ہیں پڑھنے والے'' ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی، جن میں بچوں کی پسند اور عمر کے لحاظ سے اُن کی نفسیات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ۲۰۱۶ء میں بچوں کے لئے ''کتاب میلہ اور دوسری نظمیں'' اور ''ہماری نظم'' نامی کتاب نے اشاعت پایا۔ فراغؔ روہوی شعروشاعری کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے سہ ماہی ''ترکش'' کلکتہ، ماہنامہ ''تبصرہ'' اور ''کلید خزانہ'' کلکتہ کے علاوہ دوماہی ''دستخط'' بارکپور کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ انہیں اردو ثقافتی پروگرام کے انعقاد سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ ۲۰۰۰ء میں ان کے زیر اہتمام منعقدہ ''کل ہند ماہیا مشاعرہ'' کلکتہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک یادگار رہے۔ فراغؔ روہوی کی دو غزلیں جگجیت سنگھ نے گایا ہے اور دو فلمی گیت محمد عزیز نے گائے ہیں۔ (ماخوذ)

طلحہ نعمت ندوی
Asthawan, Bihar Sharif (Mob. 9117394766)

مولانا مسعود عالم ندوی کی اُردو انشا پردازی

بہار شریف کی ایک معروف بستی اگاواں کی خاک سے اٹھنے والے مولانا مسعود عالم ندوی برصغیر کے ان ممتاز دانشور علما اور مفکرین میں شمار کئے جاتے ہیں، جن پر سرزمین ہند کو ناز ہے، انہوں نے دنیائے عرب میں اپنی عربی نگارشات اور فکری تحریروں کے ذریعہ ایک شناخت قائم کی اور عربی زبان وادب کے حوالہ سے اس سرزمین کا وقار بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بیشک وہ برصغیر میں عربی صحافت کے سالار قافلہ اور میر کارواں ہیں۔

مولانا مسعود عالم ندوی ۱۹۰۸ء یا ۱۹۱۰ء میں اگاواں ضلع نالندہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے مراحل مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں طے کئے۔ وہاں سے تکمیل فضیلت کے بعد عربی زبان وادب کی تحصیل کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ لیا اور پھر اسی کے ہو رہے۔

ندوۃ العلما میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان کو وہیں عربی رسالہ ''الضیا'' کا ایڈیٹر بنا دیا گیا، جو چار سال تک ان کی ادارت میں نہایت شان وشوکت سے نکلتا رہا اور عربی زبان کی صحافت میں اُسے ملک اور بیرون ملک بے پناہ شہرت ملی، پھر انہوں نے ایک دو سال وہاں تدریسی خدمات انجام دیں، اس دوران چندہ ماہ بجنور سے نکلنے والے مشہور اردو اخبار ''مدینہ'' کی ادارتی ذمہ داری بھی انجام دی، پھر خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں کیٹلاگر کی خدمت قبول کر کے پٹنہ آگئے اور سات سال یہاں رہ کر انگریزی میں تعارف مخطوطات کی چار پانچ جلد بھی مرتب کی۔ اس کے بعد راولپنڈی پنجاب (پاکستان) چلے گئے اور وہاں ایک ادارہ قائم کر کے دعوت اسلامی کی خدمت انجام دیتے رہے اور وہیں ۱۹۵۴ء میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

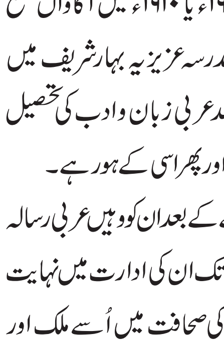

مولانا مسعود عالم ندوی عربی کے ساتھ اردو زبان کے بھی ایک ممتاز انشا پرداز تھے اور اس زبان میں بھی انہوں نے اپنی تخلیقات کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے، وہ ان کے کمال فن اور اردو نثر پر ان کی پوری قدرت کا ثبوت ہے، انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلما اور اس سے قبل مدرسہ عزیزیہ بہار شریف کے دور طالب علمی میں اردو کے اساطین فن سے بھی پوری طرح کسب فیض کرنے کی کوشش کی تھی، ان کے رفیق درس مولانا محمد ناظم ندوی کی شہادت ہے کہ انہوں نے ''الہلال'' و ''البلاغ'' کی تقریباً مکمل فائل بڑے اہتمام سے پڑھی تھی اور دبستان شبلی کے تو وہ فرزند ہی تھے اور علامہ سید سلیمان ندوی کے محبوب ترین شاگرد۔ انہوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کے فوراً بعد اپنے رفیق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو جو خط لکھا تھا اس میں خود مولانا ابوالحسن ندوی کے بقول ''الہلال'' کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی اپنے اس مکتوب میں لکھتے ہیں:

''برادر مخلص ——— ازکی التحیات

محبت نامہ ملا، وقت پر شافی جواب نہ لکھ سکا، کیوں؟ افسوس کہ عذر لنگ بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا، صرف معذرت خواہ ہوں، جذبات کا ہجوم ہے، خیالات کا انبار ہے، دل چاہتا ہے کہ دل کھول کر رکھ دوں، درد جگر کا تقاضا ہے کہ صفحہ قرطاس کو داغ ہائے جگر سے لالہ زار بنادوں، کیا لکھوں؟ اپنی تباہی کا مرثیہ؟ مگر اب یہ بھی بے سود، جنت نگاہ کشمیر کی گلگوں پیراہنی کا ذکر کروں؟ کیا فائدہ کہ اخبارات کے ذریعہ آپ کے دل ودماغ بھی اس بادہ سے مخمور ہوں گے، کیا اپنی بدنصیبی کا ماتم کروں، شیوخ قوم تو سنت سجاد کی یاد تازہ کر رہے ہیں، عالمان دین کو زنجیریں پہنائی جارہی ہیں اور ہم نشۂ غفلت سے

ایسے سرشار ہیں کہ سروں پر جوں بھی نہیں رینگتی، تمام چیزیں اپنی جگہ پر توجہ کی محتاج ہیں اور دل وجگر کو ذوق جگر کاوی دے رہی ہیں، لیکن میں نہ شب دوشنبہ کی شغل مے خواری کا ذکر چھیڑوں گا اور نہ صبح سعادت کی کیف آور رنگینیوں سے بحث کروں گا، بلکہ اجازت دیجئے تو افسانہ دیرینہ کے متعلق کچھ منتشر وغیر مربوط جملے پیش کردوں۔''

(پرانے چراغ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۳۰۵)

مولانا مسعود عالم کے متعلق جناب نیاز احمد نے ماہنامہ ''صنم'' پٹنہ کے بہار نمبر ۱۹۵۹ء میں لکھا ہے کہ جب وہ عربی مجلّہ "الضیا" کے مدیر تھے، اس وقت انہوں نے اردو میں کچھ نہیں لکھا اور ان کا سب سے پہلا مضمون ''معارف'' اعظم گڑھ میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا، لیکن یہ درست نہیں۔

۱۹۳۳ء میں ماہنامہ'' الضیا '' لکھنؤ کی ادارت کو ایک ہی سال کا عرصہ گزارا تھا کہ راجگیر (بہار شریف) سے ماہنامہ ''فطرت'' کا اجرا ہوا اس کے پہلے ہی شمارہ میں ''ندوۃ العلما'' کے عنوان سے مولانا کا اردو مضمون نظر آتا ہے پھر جب وہ ۱۹۳۵ میں مجلّہ "الضیا" کی ادارت چھوڑ کر بجنور چلے گئے اور وہاں سے نکلنے والے مشہور اخبار ''مدینہ'' کے اسٹاف میں شامل ہو گئے تو مستقل اردو میں لکھنے لگے اور اس سے قبل بھی اردو میں ان کے کئی مضامین شائع ہو چکے تھے۔

مولانا کے اسلوب نگارش میں بڑی پختگی، روانی اور بیساختگی نظر آتی ہے، ساتھ ہی ساتھ قلم وقار ومتانت اور سنجیدگی سے ہم آغوش دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے جو تاریخی کتابیں لکھی ہیں ان میں یہ وصف خاص طور سے نمایاں ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی کا ضخیم سفر نامہ ''دیار عرب میں چند ماہ'' ان کے رواں اور بے تکلف اسلوب کا کامیاب نمونہ ہے۔ روزنامہ کی حیثیت سے لکھے جانے والے اس سفر نامہ میں اسلوب کی سلاست و بے تکلفی کے ساتھ سفر نامہ کے فنی لوازم کو پوری طرح برتا گیا ہے، اس لئے اہم ادبی سفر ناموں کی فہرست سے اس کو خارج کرنا مشکل ہے، اس کے بعض نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

''طبیعت بحال ہے، تنفس کی خلش بھی جاتی رہی ہے، موسم ذرا خشک ہے، کل ہی سے ہوا تیز چل رہی ہے، آج اور تیز معلوم ہوتی ہے..... ملاقاتیں بڑھ رہی ہیں، مگر رفاقت کی مدت کم ہورہی ہے۔''

مولانا نے یہ سفر نامہ روزنامچہ کے طور پر یوں ہی وقت گزاری کے لئے لکھنا شروع کیا، یہ کوئی منصوبہ بند تصنیف نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود اس کے جملوں کی روانی، بے ساختگی میں جو حسن ہے وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں۔ اس سفر نامہ میں جا بجا منظر نگاری اور جذبات نگاری کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں، طائف کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''تین بجے سہ پہر کو طائف سے روانہ ہوئے، طائف کی سڑکوں اور بازاروں سے گزرے، لاریاں اور ٹرک بھر بھر کر حجاج کو لے جا رہے تھے، ہماری نگاہیں شہر کی عمارتوں پر تھیں، مگر دل جذبات شوق سے معمور، ایک ایک پتھر اور ایک ایک اینٹ کو شوق تجسس کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا، کیا یہ وہی طائف ہے جس نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ٹھکرا دی تھی، ایں! کیا یہی پہاڑیاں اور دشوار گزار گھاٹیاں ہیں جہاں حضرت کے قدم لہولہان ہوئے تھے، موٹر دو متوازی سلسلوں اور پر پیچ گھاٹیوں سے ہو کر جا رہی تھی اور یہ گنہ گار بار بار دل میں کہتا، یہ راستہ تو روندنے کے قابل نہیں، ہم اپنے کو داعی کہتے ہیں تو پھر کیوں سب سے بڑے داعی حق کے نقش قدم پر چلنے کی ہمت نہیں کرتے؟'' (دیار عرب میں چند ماہ، ص ۱۳۰)

مدینہ منورہ کے سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صبح ہوئی، قافلہ روانہ ہوا اور مدینہ منورہ کی قربت طبیعت کو اکتانے لگی، ابھی تین چار گھنٹے کی مسافت باقی ہے، لیکن دل ابھی سے لرزنے لگا ہے، مدتیں گزریں، زمانہ بیت گیا، مدینہ کی حاضری کا شوق دل میں چٹکیاں لیتا رہا، بار ہا فرط شوق میں آسی غازی پوری کا پر کیف مطلع پڑھتا رہا.....''

مولانا محمد ناظم ندوی جو ان کے رفیق ہیں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے علمی ماحول میں انہیں اپنے علمی ذوق کی تکمیل کا پورا موقع ملا، اس کے عظیم الشان کتب خانہ میں ہر علم وفن پر اعلیٰ درجہ کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ دارالعلوم میں داخل ہوئے ابھی چند ماہ بھی نہیں گزر پائے تھے کہ اپنی خداداد ذہانت، غیر معمولی علمی ذوق اور مطالعہ کی بدولت ان کا شمار ممتاز طلبا میں ہونے لگا انجمن ’الاصلاح‘ کی کتابوں کے مطالعہ کا الگ موقع ملا، انجمن ’الاصلاح‘ کو طلبائے دارالعلوم کے افکار و خیالات اور ان میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں بڑا دخل رہا ہے، اس میں مختلف علوم وفنون پر اردو زبان میں بیش بہا سرمایہ ہے۔ ہندوستان کے مشہور مصنفین کی تقریباً تمام تصنیفات، عربی و اردو کے مشہور اخبارات کے فائل موجود ہیں، تاریخ ادب عربی اور صحافت سے انہیں ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔ ان کے مطالعہ کی رفتار بہت تیز تھی انہوں نے بہت جلد انجمن ’الاصلاح‘ کو کھنگال کر اس کا مغز ہضم کر لیا، انجمن ’الاصلاح‘ کی بدولت اچھے اچھے اہل قلم، ادیب اور افسانہ نگار پیدا ہوئے، ان میں مسعود عالم صاحب کا پایہ بہت بلند ہے۔‘‘

آگے وہ لکھتے ہیں:

’’زمانہ طالب علمی میں اردو ادب میں چکبستؔ، شرؔر اور پریم چند کے ناول اور افسانے بڑے ذوق سے پڑھا کرتے تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی کے زبان وادب کے بڑے قدرداں تھے، سچ اور ’صدق‘ کے پرانے فائل تک پڑھا کرتے۔‘‘ (ماہنامہ چراغ راہ، کراچی، مارچ ۱۹۰۰)

انہیں کی اطلاع کے مطابق ’’الہلال‘‘ کا بھی انہوں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا جس کی جھلک ان کی ابتدائی تحریروں میں نظر آتی ہے۔

ان کے اسلوب کو دیکھ کر علامہ سید سلیمان ندوی نے ابتدا ہی میں ان کا نام بہار کے ان نوجوان فضلا اور اہل قلم میں ذکر کرتے ہوئے یہ پیشینگوئی کر دی تھی کہ وہ مستقبل میں اردو ادب کے افق پر روشن ہوں گے، سید صاحب کی یہ پیشینگوئی درست ثابت ہوئی۔ ❁❁

مولانا مسعود عالم: ایک ممتاز مورخ، مفکر اور صحافی

مولانا مسعود عالم ندوی، بیسویں صدی کے حوالے سے بہار کی علمی تاریخ کا ایک اہم نام ہے۔ انہوں نے اگرچہ مختصر عمر پائی اور محض ۴۳ سال میں آخرت کا سفر اختیار کر لیا، لیکن ایک مورخ اور ممتاز عربی انشاپرداز کی حیثیت سے ان کے کارنامے بہر حال یادگار ہیں۔ ان کی تحقیقی محنتوں کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ ’’محمد بن عبدالوہاب: ایک مظلوم اور بدنام مصلح‘‘ اور ’’ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک‘‘ نامی ان کی اردو کتابیں، اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی پچاسوں کتابوں کے حوالے سے مزین ہیں۔ انہوں نے ’’عربی شاعری پر اسلام کا اثر‘‘ کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ وہ عربی زبان وادب اور سیرت نگاری کا نہایت بلند علمی ذوق رکھتے تھے۔ عربی رسالہ ’’الضیا‘‘ کی ادارت سے عالم عرب میں ان کی عربی انشاپردازی کا خاص شہرہ ہوا اور اس سلسلے میں لبنان کے ممتاز صحافی وادیب امین ناصر الدین نے یہاں تک لکھ دیا کہ عربوں کے لئے مقام غیرت ہے کہ ان کے اکثر و بیشتر رسالوں سے اس عجمی ملک کے رسالہ کی زبان بہتر اور برتر ہے۔ اسی طرح شام کے عیسائی عربی ادیب نے بھی مولانا مسعود عالم ندوی کو، ان کی کم عمری کے باوجود ’’علامہ‘‘ اور ’’محقق‘‘ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ ان کے اندر قومی و ملی حالات کو صائب فکر کے ساتھ بدلنے کا زبردست جذبہ تھا۔ مولانا مسعود عالم اندھی تقلید کے ہرگز قائل نہ تھے بلکہ وہ آزادی فکر ورائے سے کام لیتے تھے، تنقید کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور خود بھی بے لاگ اور نہایت معقول تنقید کا اظہار کرتے تھے۔ اس تعلق سے ان کی کتاب ’’مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار وخیالات پر ایک نظر‘‘ اور ’’اشتراکیت اور سلام‘‘ یقیناً نہایت اہم قرار پائی ہے۔ اسی طرح ’’عربوں کی قومی تحریک‘‘ پر ان کا طویل مقالہ بھی نہایت ہی پرارزش ہے۔ (سید محمد اقبال کے مقالہ مشمولہ ’’عالمی سہارا‘‘ نیا بہار نمبر ۲۰۰۷ء، ص ۶۴ سے خصوصی اخذ واستفادہ کے ساتھ)

زیبا راشد
Deewan Mohalla, Patna City - 800008

شاعرِ رومان: اخترؔ شیرانی

قدرت کا نظام بہت ہی عجیب وغریب ہے اور بسا اوقات انسانی عقل سے باہر۔ یہ ہمارا عام مشاہدہ اور مطالعہ ہے کہ اس دنیا میں انسان آتا ہے، زندگی کے مختلف شعبے میں اپنے کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے اور پھر خود عمر کہولت تک پہنچ کر آخرت کے لئے رختِ سفر باندھ لیتا ہے، مگر نہ تو اس کی طویل زندگی میں اس کی خدمات کا شہرہ ہو پاتا ہے اور نہ ہی دنیا سے گزر جانے کے بعد، اسے تا دیر مقبولیت ملتی ہے، جب کہ بعض فنکار، ادیب و شاعر اتنی مختصر عمر لے کر آتے ہیں کہ انہیں بڑھاپے کا منھ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا، مگر روز اوّل سے ہی ان کے رشحاتِ قلم کا ڈنکا بجنے لگتا ہے اور ان کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ان کے تذکرے چہار دانگ ادب میں مسلسل پھیلتے رہتے ہیں۔

معروف ومقبول زمانہ شاعر اخترؔ شیرانی کا نام بھی ایسی ہی شخصیتوں میں شامل ہے کہ وہ آج سے تقریباً ایک سو بیس سال پہلے ۴؍مئی ۱۹۰۵ء کو اس جہاں رنگ و بو میں آئے اور آزادیٔ وطن کے بعد تقریباً ۱۳ مہینے گزار کر ۹؍ستمبر ۱۹۴۸ء کو محض ۴۳ سال کی عمر میں یہاں سے چل بسے، مگر اس مختصر سی عمر میں انہوں نے نہ صرف اردو شاعری میں، بلکہ اردو نثر میں بھی اپنے یادگار کارناموں کا ایسا اور اتنا ذخیرہ چھوڑا کہ بسا اوقات لمبی عمر تک لکھنے پڑھنے میں مسلسل مصروف رہنے والوں سے اس کا نصف سرمایہ بھی بعد کی نسلوں تک نہیں پہونچتا ہے۔

اخترؔ شیرانی کا اصل نام داؤد خاں اور تاریخی نام مسعود خسرو ہے، لیکن ادب اور شاعری کی دنیا میں وہ قلمی نام اخترؔ شیرانی سے ہی جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ اخترؔ کا جدی وطن ٹونک ہے، کیوں کہ ان کے آباو اجداد یہیں کے باشندے تھے۔ وہ لوگ صوبہ سرحد سے راجپوتانہ آئے تھے اور یہیں مستقل بود و باش اختیار کر لیا تھا۔ اخترؔ شیرانی کے دادا کا نام مولوی محمد اسمٰعیل خاں تھا جو ٹونک کے معزول نواب محمد علی خاں کے مختار تھے۔ اخترؔ شیرانی کے والد کا نام محمود شیرانی ہے جو اردو فارسی کے بڑے عالم وفاضل اور ایک بلند مرتبہ محقق کی حیثیت سے علمی دنیا میں اپنی شہرت اور شناخت رکھتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی ۱۹۱۳ء میں جب انگلستان کے علمی سفر سے اپنے وطن ٹونک واپس آئے تھے تو اس وقت ان کے اس ہونہار بیٹے کی عمر تقریباً آٹھ سال ہو چکی تھی، چنانچہ انہوں نے اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ اتالیق کا انتظام کیا اور اس زمانے کے دستور کے مطابق بڑے ہی ناز و نعم سے اخترؔ کی پرورش ہوتی رہی۔

گھر میں خوش حالی کا دور دورہ تھا اور کسی چیز کی کمی نہ تھی، یہاں تک کہ اخترؔ شیرانی کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ بچپن میں انہیں جب گھر سے باہر جانا ہوتا تھا تو اکیلے نہیں جانے دیا جاتا تھا، بلکہ ایک شخص ہمیشہ ساتھ رہا کرتا تھا۔ اخترؔ بچپن سے ہی بڑی حساس طبیعت رکھتے تھے۔ یہ اخترؔ کے بالکل عنفوانِ شباب کی بات ہے کہ پندرہ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۲۰ء میں جب ان کے والد کو کسی وجہ سے اپنے بال بچوں کے ساتھ ٹونک چھوڑنا پڑا اور وہ جودھپور کے راستے سے لاہور کے لئے عازمِ سفر ہوئے تو وہ بھی لاہور چلے آئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ صرف پندرہ برس کی عمر میں اخترؔ سے ان کا وہ آبائی وطن چھوٹ گیا، جہاں انہوں نے شعر و شاعری کی رنگینیاں دیکھی تھیں اور جہاں کے ماحول نے فطری طور پر ان کے اندر شعر و شاعری کا ذوق جگا دیا تھا۔

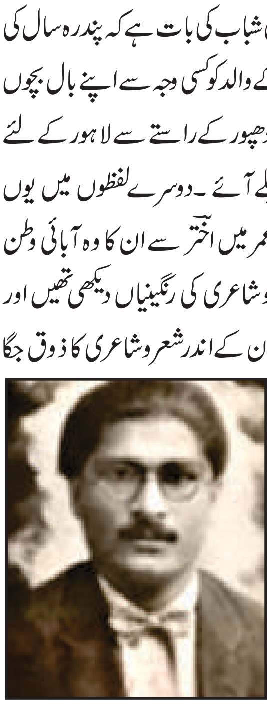

لاہور میں اخترؔ شیرانی نے اورینٹل کالج سے ۱۹۲۱ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۲ء میں ادیب فاضل کی سند حاصل کی۔ ان کے والد خود ایک بڑے عالم ومحقق تھے اور وہ اپنے صاحب زادے کو بھی

اچھی سے اچھی اور اونچی سے اونچی تعلیم دلانا چاہتے تھے، مگر یہ دنیا کا نظام ہے کہ بیٹے کے لئے باپ کی ساری تمنائیں بسا اوقات پوری نہیں ہوتیں، محمود شیرانی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

اختر سے ٹونک کا رنگین شاعرانہ ماحول ضرور چھوٹا تھا، مگر اس سے ملنے والے شعری و ادبی جراثیم ان کے دل و دماغ میں پوری طرح گھر کر چکے تھے اور اپنی پوری قوت کے ساتھ فعال بھی تھے، پھر لاہور کی ادبی دنیا بھی اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے کچھ کمزور نہ تھی، قصہ مختصر یہ کہ اس نے اختر جیسے پر شباب نوجوان کے احساسات و جذبات کو باندازِ دگر اپنی گرفت میں لے لیا اور ایک طرف جہاں حافظ محمود شیرانی اور علامہ تاجور نجیب آبادی کے اس شاگرد نے علمی و ادبی دنیا میں شعریات و نثریات کے حوالے سے اپنے ذہن و قلم کی جولانیاں دکھائیں اور وقت کے ساتھ ساتھ احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، ن۔م۔راشد، میرزا ادیب اور آدا جعفری جیسے نام خود اس کے تلامذہ کی فہرست میں آتے گئے، وہیں دوسری طرف خود اس کی شاعری اور اس کی نثری کتابوں نے اپنا ایک مقام و معیار زمانے کے سامنے لا دیا۔

اختر شیرانی نے ۱۹۲۴ء کے آس پاس سے شاعری شروع کی، ان کے فردوسِ سخن کی ''سلمیٰ'' اور ''ریحانہ'' مشہورِ زمانہ ہیں۔

اختر شیرانی کے شعری مجموعے ''پھولوں کے گیت'' (بچوں کے لئے) ''نغمۂ حرم'' (عورتوں کے لئے نظمیں) ''شعرستان''، ''صبحِ بہار''، ''اختر ستان''، ''طیورِ آوارہ''، ''شہناز''، ''لالہ طور'' اور ''شہرود'' بار بار شائع ہوتے رہے ہیں، ان میں نظموں کے علاوہ غزلیں، گیت، رباعی، سانیٹ، ماہیے اور نعتیں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ نثر میں بھی ''ضحاک''، ''آئینہ خانے میں''، ''دھڑکتے دل''، ''وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ''، ''آزاد کے کارنامے''، ''فوجی کے کارنامے'' اور ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' (مرتبہ) اشاعت یافتہ ہیں۔

اختر شیرانی کا زمانہ بیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ ہے اور یقیناً ان کے نام کے ساتھ ادب و شاعری کی بہت ساری اولیات وابستہ ہیں۔ وہ اردو ادب کی تاریخ میں پہلے شاعر ہیں جنہیں، ''شاعرِ رومان'' کے خطاب سے نوازا گیا ہے اور بجا طور پر انہیں ایک طرزِ نو کا موجد کہا جاتا ہے۔ یہ اختر شیرانی جیسا فنکار ہی ہے جس نے ایک نہایت قدیم روایت کو پاش پاش کر دیا ہے اور مرد کو معشوق ماننے کی بجائے عورت سے براہ راست مخاطب ہوا ہے۔ عورت کو اعلانیہ محبوبہ ماننا ایک بات نہیں، اردو کی دیرینہ شعری روایت کے تناظر میں بہت بڑی، بہت ہی جرات مندانہ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بالکل ہی فطری بات ہے، جس نے لامحالہ اختر کی شاعری کو فطری شاعری کا منصب بخش دیا ہے۔

اختر شیرانی کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ خاص بات سامنے آتی ہے کہ اردو شاعری جواب تک فارسی روایات کے زیرِ اثر تھی اور فارسی دواوین کے مطالعہ سے متاثر، اسے اختر نے عربی شاعری کی روایت کے زیرِ اثر لایا اور خاموش مطالعہ کے ساتھ اس کے انفس و آفاق بدل دیے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اختر کی شاعری میں محبوب کا ذکر، تذکیر کے صیغہ میں نہیں ہے، بلکہ اس نے سابقہ روایت سے یکسر انحراف کرتے ہوئے تانیث کے صیغہ کا استعمال کیا ہے جو دراصل عربی شاعری سے استفادہ ہے، جہاں ''بنتِ عم'' کا برملا ذکر ملتا ہے۔ اختر کی اس روش کو ایک اور رخ سے اردو شاعری میں تانیثی رجحان کے برملا شعوری اظہار کی بے نام، مگر کامیاب اولین روش بھی کہہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اختر شیرانی کی شاعری کا مرکزی خیال عشق و محبت ہے اور بلاشبہ ان کے یہاں رومانیات و جمالیات، کیف و سرور اور سوز و ساز کے علاوہ معصومانہ جذبات اور نغمات کی سحر آفرینیاں بھی یقیناً اپنی مثال آپ کہلانے کا حق رکھتی ہیں، آیئے آگے بڑھنے سے پہلے اختر کے کچھ اشعار سے ضیافت کی مسرت حاصل کی جائے۔

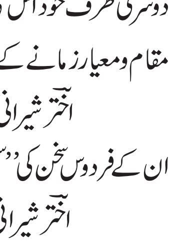

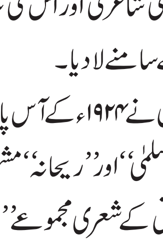

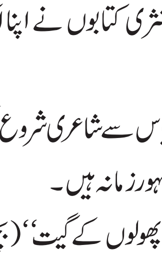

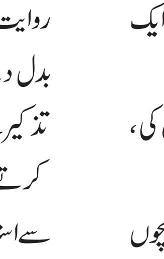

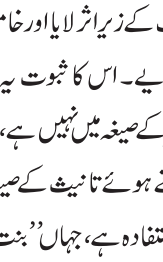

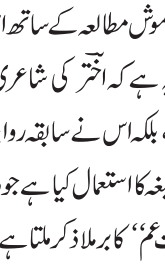

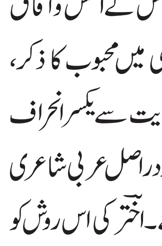

محبت کے لئے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں
محبت خون بن کر لہلہاتی ہے مرے دل میں

ہر اک شاعر مقدر اپنا اپنا ساتھ لایا ہے
محبت کا جنوں تنہا مرے حصے میں آیا ہے

میرا ہر شعر ہے اختر مری زندہ تصویر
دیکھنے والے نے ہر لفظ میں دیکھا ہے مجھے

یہ اشعار محض شاعرانہ خودستائی کا اظہار یا سخن بہر سخن کے مصداق نہیں ہیں، بلکہ اختر کا سارا شعری سرمایہ اُس کے اِس دعوے پر صاد کرتا چلا جاتا ہے۔ شاعر کے دل میں بس ایک ہی تمنا ہے، جی بھر کے پیار کر لینے کی تمنا اور اس نے کسی ایں وآں کے بغیر اس کا کھلا اظہار بھی کر دیا ہے ؂

خدائی بھر میں کسی شے کی جستجو ہی نہ تھی
سوائے اس کے کچھ اختر کی آرزو ہی نہ تھی
ستم شعار کو جی بھر کے پیار کر لیتے

اختر شیرانی نے جیسا کہ ذکر آچکا، عورت سے راست خطاب کی شاعری سے ہی سرتاسر سروکار رکھا ہے، وہ عربی روایات سے استفادہ کرنے والا شاعر ہے، یہاں تک کہ اس نے اپنی محبوباؤں کے جو نام اپنی شاعری میں لایا ہے، وہ اگر چہ ہندوستانی معاشرے میں متداول ہیں، لیکن اصلاً عربی نام ہیں۔ اختر شیرانی کا یہ بھی اختصاص ہے کہ وہ جب اپنی محبوبہ کو یاد کرتا ہے تو بالعموم اس کے حسن بلاخیز اور اس کے نورانی پیکر کے ذکر ہی سے اپنی شاعری کے در و بام سجاتا ہے ؂

بہار حسن کا تو غنچہ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دست رنگیں سے سنوارا ہے
بہشت رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارہ ہے
تری صورت سراپا پیکر مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجوم ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ

اردو اور فارسی کی رومانی شاعری میں ایسی مثالیں تو بھری پڑی ہیں، جہاں گوشت پوست کی محبوبہ کے ''بال'' (زلف وگیسو) کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے گئے ہیں، مگر ایسی مثال شاید ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکے، جہاں محبوبہ کی ''کھال'' (جلد و پوست) کو اس طرح حسین تشبیہ کے ساتھ بالکل محسوساتی انداز سے سراہا گیا ہو۔ اختر شیرانی کے یہاں بلاشبہ تخیل کی رنگینی اور نزاکت ادا کے ساتھ ساتھ لطیف موسیقی کی نہایت خوشگوار آمیزش ملتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے غلط نہیں لکھا ہے کہ:

''اختر شیرانی اپنے وقت میں رومانیت کا امام تھا۔ اس کی شاعری میں ترنم، نغمگی، شادابی اور شدید عاشقانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔''

اور پھر آل احمد سرور کے اس خیال سے بھی کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ:

''اختر شیرانی کے یہاں ایک ایسی سرمستی، ایک ایسا شدید احساس اور ایک ایسی تیزی و تندی پائی جاتی ہے کہ ان کی غزلیں بھی جواں معلوم ہوتی ہیں۔ اختر کی دنیا سلمیٰ اور اس کے عشق کی دنیا ہے۔ ان کے یہاں نشہ جوانی ہی سب سے بڑی چیز ہے، ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں ہی یکساں معلوم ہوتی ہیں۔''

اختر شیرانی کی شاعری کا تمام تر سرمایہ عشق و محبت اور شباب و رومان کے رنگ و آہنگ سے ممتاز ہے، اسی لئے بعض ناقدین نے انہیں ''سراپا غزل'' کا خطاب دیا ہے اور اختر شیرانی کے حسن تخیل کا کیا کہنا، واقعی بقول آغا حشر کاشمیری ان کے یہاں ''ہزاروں جنتیں آباد'' ہیں ؂

کہو زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخیل اختر میں

آغا حشر نے یہ شعر، اختر شیرانی کی ایک نظم سے متاثر ہو کر کہا تھا اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ واقعی اختر کی شاعری میں کس قدر پر اثر رومان رچا بسا ہوا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے یہاں صرف رومان ہی رومان ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جدید اردو شاعری میں قدیم روایات کے احساسات کے ساتھ ساتھ فکر و فن کے نئے رنگ و آہنگ کی جو جلوہ گری نظر آتی ہے، وہ سب کچھ بھی اختر شیرانی کے یہاں کوٹ، کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔

اختر شیرانی نے اپنی شاعری میں دو نسائی ناموں کا بار بار ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک ''سلمیٰ'' ہے اور دوسری ''ریحانہ'' ان

دونوں کے علاوہ اختر کی شاعری میں ایک نام ''عذرا'' بھی ہے۔ اختر کی سلمٰی اس کا خیالی پیکر ہو یا کوئی حقیقی روپ، بہر حال اختر نے اپنی شاعری میں، اسے اتنی شدت سے اور ایسے والہانہ انداز میں یاد کیا ہے کہ پڑھنے والے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثال کے لئے اختر کی وہ نظم دیکھی جاسکتی ہے جو ''سلمٰی سے معنون'' ہے اور جس کا ایک بند اس مضمون میں نقل ہو چکا ہے۔

اختر شیرانی کی ایک اور مشہور نظم ''ریحانہ'' سے متعلق ہے جس میں شاعر نے اس وادی کا ذکر کیا ہے جو ریحانہ کے وجود سے آباد تھی۔ اس نظم میں انہوں نے ''ریحانہ'' کو ''جان کعبہ اور عظمت بت خانہ'' کہہ کر گویا نہایت فنی چابک دستی کے ساتھ، اپنی محبوبہ کے توسط سے دیر و حرم کو ملا دیا ہے۔ اختر شیرانی کی ایک اور طویل نظم ''بستی کی لڑکیوں میں'' ہے جس کو انہوں نے ''ایک دیہاتی گیت'' کے نام سے موسوم کیا ہے اور منظر نگاری کو اوج کمال پر پہنچا دیا ہے۔

اختر شیرانی کی ایک اور بہت ہی پیاری نظم ''آج کی رات'' ہے۔ یہ رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ نیچرل بھی ہے، پھر نظم ''اعتراف محبت'' میں انہوں نے مسلسل غم واندوہ سے تنگ آ کر اپنی محبت کی حقیقت افشا کی ہے اور اس کی سچائی کا یقین دلانا چاہا ہے۔ نظم ''اے عشق! کہیں لے چل'' میں اختر نے دنیا سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح اختر شیرانی کی ایک اور نظم ''دنیا کی بہار'' بھی نہایت ہی پر اثر نظم ہے جس کا یہ شعر زبان زد خاص عام ہے ؎

نہ لے جا خلد میں یا رب، یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو

دنیا کو دُکھوں کا گھر کہنے والے اور اُس کو جہنم سے تشبیہ دینے والے شاعر تو بہت ہیں، مگر دنیا کو دار طرب اور سراپا جنت کہنے والے اختر شیرانی جیسے شاعر نایاب نہیں تو یقیناً کمیاب ضرور ہیں۔ اختر کی نظر میں اصلاً بیماری وہ نہیں ہے جو طبیبوں کے علاج سے دور ہوتی ہے، بلکہ اصلاً بیماری اور علالت تو وہ ہے جس کا رشتہ عشق و رومان سے ہوتا ہے ؎

ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یا رب
آج معلوم ہوا مجھ کو علالت کیا ہے

اگر یہ سچ ہے کہ شاعری سادگی، پرکاری اور بیساختگی جیسے وصف سے مقبول ہوتی ہے اور خیالات کی صداقت اسے اعتبار بخشتی ہے تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اختر کی شاعری ان اوصاف کا بہترین مجموعہ ہے اور انہیں خوبیوں سے آج بھی وہ دلکش و دل نواز بن رہی ہے۔

اختر شیرانی کا کلام خواہ وہ کسی صنف میں ہو، بہر صورت ''مترنم خیال'' کا درجہ رکھتا ہے اور کسی بھی طرح اسے مانگے کا اجالا نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ اس کی رومانی طبیعت سے پھوٹنے والے نغموں کی کرنیں ہیں جو اب بھی زمانے کو مسحور کئے ہوئے ہیں۔

اختر نے ترقی پسند شاعری کا عہد شباب دیکھا اور وہ بھی پنجاب کی دھرتی پر دیکھا، جہاں اس تحریک کا الگ ہی رنگ تھا، مگر یہ اس کا کمال ہے اور اس کی رومان پسندی بشرط استواری کہ اس راہ کی طرف جانا تو دور کی بات رہی، اس نے کبھی گھوم کر بھی اس دنیا کی طرف نہیں دیکھا بلکہ اپنی طبیعت کے تقاضے سے انحراف کئے بغیر ولولہ انگیزی، بربطی کیفیت اور مصوری و منظر کشی کے اوصاف عالیہ سے اپنی عروس سخن کو سجاتا رہا اور اس احتیاط کے ساتھ سجاتا رہا اور دکھاتا رہا کہ اس میں آج بھی کہیں کسی قسم کے ابتذال، رکاکت، جنسی ہوس رانی اور فکری عدم طہارت کی تلاش بسیار کے باوجود بھی کوئی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ نظم ''انتظار''، ''برکھارت'' اور ''او دیس سے آنے والے بتا'' اگر ہمارے سامنے ہو تو اس کی شاعری کا فنی مرتبہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں۔ اختر اورینوی نے سچ لکھا ہے کہ:

> ''اختر کی شاعری میں حواسیہ انداز بہت نمایاں ہے، ان کی شاعری شدید قسم کی جذباتی شاعری ہے اور کیٹس کی فینی کی طرح، اختر کی سلمٰی اور ریحانہ، ان کی شاعری کی روح ہیں۔''

واقعی اختر شیرانی کے یہاں رومانیت کی خوشبو رچی بسی ہے، یہاں تک کہ بقول عبادت بریلوی:

> ''ان کے نغموں اور نالوں سے متاثر ہوکر، ہم انہیں خالص رومانی شاعر کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔''

❀❀❀

شاہد حسین
M.A. (Urdu) Daronda College, Daronda, Ranchi

الیاس احمد گدی اوران کا ناول فائر ایریا: ایک مطالعہ

اردو میں ناول نگاری کی روایت یوں تو بہت زیادہ پرانی نہیں، مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت کم عرصہ میں اردو ادب میں بہت سے بہترین اور لازوال ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ شروعاتی دور کے بعد ترقی پسند نظریے کے زیر اثر اس میں حقیقت پسندی کو فروغ حاصل ہوا۔ بیسویں صدی کو الوداع کہہ کر اکیسویں صدی کا خیر مقدم کہنے والے ناول نگاروں میں مظہر الزماں، کوثر مظہری، اقبال مجید، انور سجاد، احمد صغیر، غضنفر، سید محمد اشرف وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کے یہاں ہر طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔ اسی فہرست کا ایک اہم ترین نام الیاس احمد گدی بھی ہے، جن کا ناول ''فائر ایریا'' مشہور زمانہ ہے، جس میں انہوں نے مزدوروں کے رنج والم کی دردناک تصویر کشی کی ہے اوران مزدوروں کے استحصال، کسمپرسی کی آواز کو بہت ہی شدت سے اٹھایا ہے۔

الیاس احمد گدی ضلع دھنباد کے شہر جھریا سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز افسانے سے کیا۔ ''فائر ایریا'' سے پہلے ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ ''آدمی'' ان کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۰ء میں چھپا تھا اور ''تھکا ہوا دن'' دوسرا مجموعہ جو ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ کئی ناول بھی ان سے یادگار ہیں پہلا ''زخم'' اور دوسرا ''مرہم'' اور اس کے بعد ''فائر ایریا'' ان کا آخری ناول ہے۔

''فائر ایریا'' پہلی مرتبہ گدی محلہ جھریا دھنباد سے ۱۹۹۴ء میں اور دوسری مرتبہ فضلی سنز کراچی (لاہور) سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ ۳۶۷ صفحات پر مشتمل ''فائر ایریا'' کی کہانی کول فیلڈ میں کام کرنے والے محنت کشوں کی سسکتی، بلکتی زندگی پر مبنی ہے، جس میں کولیری کے غریب مزدوروں کے استحصال ان کے ساتھ ہو رہی ناانصافی، ظلم، قتل و غارت گری کی تصویریں ملتی ہیں۔

ناول ''فائر ایریا'' بیانیہ ہیئت میں ہے جس میں فلش بیک کی تکنیک کا استعمال ہوا ہے۔ کرداروں کے ماضی کا تعارف اوران کی داخلی کشمکش کو ظاہر کرنے کے لئے شعور کی رو کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے۔ یہ ناول تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں کہانی کی ابتدا کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان آزاد ہو چکا ہے، مگر مزدوروں کی حالت میں کوئی سدھار نہیں آیا، کیونکہ یہاں ٹھیکیدار، منشی اور سیاسی ایجنٹ صرف اپنی جیب بھرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس ناول کا تیسرا حصہ اُس زمانے سے تعلق رکھتا ہے، جب کہ ہندوستان کی تمام کول فیلڈ کو قومیا لیا جاتا ہے۔ مزدوروں کو اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ اب ان کے ساتھ انصاف ہوگا، مگر حالات اور بھی پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ مصنف کے الفاظ میں:

> ''تین خانوں میں بٹ گئی ہے کولیری کی یہ ساری دنیا، بڑے آفیسر جو صاحب کہلاتے ہیں، آفس اسٹاف جنہیں بابو کہا جاتا ہے اور سب سے آخر میں مزدور جن کے پاس کوئی خطاب نہیں ہے۔ بڑے آفیسر چاندی کاٹ رہے ہیں، آفس اسٹاف بھاگتے لوگوں کے پاؤں کھینچ رہا ہے اور مزدور جن کے پاس وہی اندھیری سرنگیں ہیں۔''

گدی کے اس ناول کا موضوع ایک مسلسل ناانصافی اور ایک مسلسل استحصال ہے، جسے انہوں نے بچپن سے جوانی تک دیکھا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ کول فیلڈ کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے۔ استحصال کا کرب مزدوروں کے ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے، لیکن وہ گھٹ گھٹ کر زندگی کا زہر پینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ حق کی آواز بلند ہوتی ہے، لیکن وہ اتنی شدت سے دبادی جاتی ہے کہ

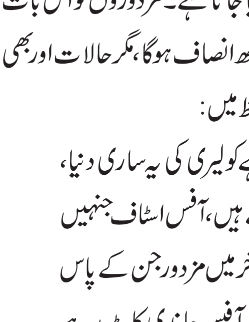

رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بھوک، مجبوری، لاچاری، بے بسی، غریبی اور ظلم کا ننگا ناچ روز مرہ کی زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ ''فائر ایریا'' کا یہ اقتباس دیکھئے:

''یہاں کول فیلڈ میں بس دو فیکٹر کام کرتا ہے ایک پیسہ اور دوسرا طاقت۔ کچھ خاص لوگوں کو پیسہ سے خرید لیا جاتا ہے اور باقی کو طاقت سے دبا دیا جاتا ہے اور مزدور لوگ اتنے معصوم ہیں کہ کچھ نہیں جانتے، اتنے کمزور ہیں کہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ زندہ رہنا یا یوں کہہ لیجیے کہ اپنے آپ کو زندہ رکھنا ان کے لے شرط ہوگیا ہے۔ بس کام کرو اور کھانا کھاؤ۔ دیکھو سنو، مگر بولو کچھ نہیں۔ کوئی آواز نہیں، دہشت کی ایک دنیا ان کے چاروں اور کھڑی کردی گئی ہے اور یہ اس سے اتنے خائف ہیں کہ احتجاج کا خیال تک ان کے دماغ سے نکل گیا ہے اور یہ ایک بڑا المیہ ہے، بہت بڑا المیہ، ان تمام کی موت سے بھی بڑا المیہ......''

ان مزدوروں کی حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ یہ مزدور اپنے اہل وعیال کو چھوڑ کر دن رات محنت مشقت کرتے ہیں، مگر ان کی حالت وہی رہتی ہے۔ انہیں پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ ان میں سے اگر کوئی آواز بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے جان دے کر اس کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ یہ مزدور ایک طرف فیکٹری مالکان اور ایک طرف سودخوروں کے چنگل میں گرفتار رہتے ہیں۔ ارشد احمد کے لفظوں میں:

''وہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک زمین کے ہزاروں فٹ نیچے شدید گرمی میں اپنا پسینہ پانی کی طرح بہاتے ہیں، مگر اپنے نوشتۂ تقدیر میں تغیر وتبدیلی نہیں کر پاتے۔ وہ ایک طرف کمپنیوں کے مالکان، یونین لیڈروں اور ان کے کارندں کے شکنجہ میں جکڑے ہوتے ہیں تو دوسری طرف سودخوروں کے چنگل میں گرفتار رہتے ہیں جوان کے جسم سے اس طرح خون چوس لیتے ہیں کہ چاہ کر بھی کھڑے نہیں ہو پاتے۔'' (سہ ماہی اردو ریسرچ جرنل، ص ۹۰)

ناول ''فائر ایریا'' میں مزدوروں پر ہونے والے استحصال کی جو سچی تصویر کشی کی گئی ہے اس میں کردار نگاری اور جزئیات نگاری اہم رول ادا کرتی ہے۔ مرکزی قصے کے علاوہ ضمنی قصے کو بھی اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ تمام نقشہ نظروں کے سامنے ابھر کر آ جاتا ہے۔ بقول سلام بن رزاق:

''مالکوں کا جبر، مافیا کی دہشت گردی، لیڈروں کی مکاری، ٹھیکیداروں کی غنڈہ گردی، ٹریڈ یونینوں کا آپسی تصادم، مزدوروں کا استحصال، غربت اور بھوک، پونے چار سو صفحات میں منصف نے کول فیلڈ کی چھوٹی سے چھوٹی بات اور معمولی واقعہ کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ناول ایک دستاویزی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔''

(معاصر اردو ناول مرتبہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، ص ۹۹)

اس ناول میں مصنف نے احتجاج کی آگ کو دکھلانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مثلاً ناول کے ایک اہم کردار مجمدار کے یہ الفاظ دیکھئے:

''غریب چھوٹا اور نیچ انہیں بھگوان نے نہیں بنایا۔ انہیں گرایا گیا ہے، ان کا استحصال کیا گیا ہے۔ ان کو بھوکا اور ننگا رکھ کر ان کو سود میں جکڑ کر، مار پیٹ کر ان کو اس حد تک پہنچا دیا گیا ہے کہ سارا سماجی شعور سارا معاشرتی اور تہذیبی تشدد ان کے یہاں مفقود ہوگیا ہے۔ صرف ایک بات وہ جانتے ہیں زندہ رہنا ہے۔ وہی بات جو ایک جانور جانتا ہے۔''

اور ان سب باتوں کا اثر اور خاص کر وہ آگ جو مزدوروں کے دلوں میں صدیوں سے جل رہی تھی، تب ابھر کر سامنے آتی ہے، جب کہ مجمدار کا قتل ہو جاتا ہے اور سارے مزدور ہاتھ میں جھنڈا لے کر اور ان سب کی ایک ہی آواز ہوتی ہے: ''ہمیں انصاف دو، قاتلوں کو پھانسی دو۔'' انہیں دیکھ کر کول مائن افسروں، یونین لیڈروں کے پیروں تلے سے زمین کھسک جاتی ہے اور وہ ایک بڑے انقلاب کی کھلی دستک بالکل قریب سے سننے لگتے ہیں۔ بیشک الیاس احمد گدی کا ناول ''فائر ایریا'' ہر اعتبار سے اُن کی ایک شاہکار تصنیف کہلانے کا حقدار ہے۔ ❀❀

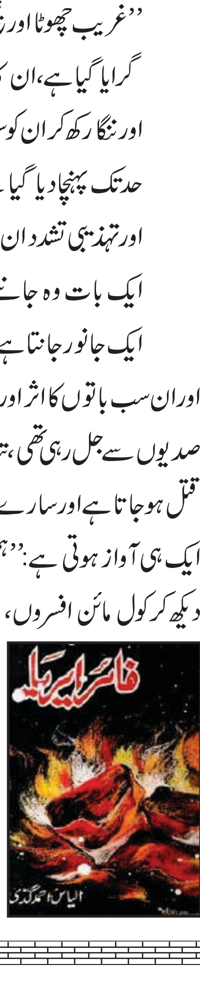

افسانے

صادق چوبک

ڈاکٹر مہتاب جہاں

Associate Prof. Dept. of Persian, Delhi University, Delhi - 110007 (Mob. 9717412946)

عدل

صادق چوبک فارسی جدید کا مایہ ناز فکشن نگار گزرا ہے اور ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی دنیا میں اپنی خاص انفرادیت رکھتا ہے۔ ''خیمہ شب بازی'' اُس کی مشہور کتابوں میں شامل ہے۔ صادق چوبک اپنے ہم نام اشترا کی فکشن نگار صادق ہدایت سے بہت متاثر تھا۔ صادق چوبک کی ولادت ۱۹۱۶ء میں ایران ہوئی اور ۱۹۹۸ء میں کیلی فورنیا میں انتقال کے بعد، اپنی وصیت کے مطابق نذر آتش کر دیا گیا۔ صادق چوبک نے اپنی کہانیوں میں نہ صرف انسانوں کو بلکہ حیوانوں کو بھی بڑی ہنرمندی سے کردار بنایا ہے۔ اس کا افسانہ ''عدل'' اک ایسا ہی افسانہ ہے، جس میں زخمی گھوڑے کی سوکھی آنکھیں انسانی معاشرہ کی سوچ اور اس کے عمل پر خاموش تبصرہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ (م۔ج)

تانگے کا گھوڑا ایک چوڑی وسیع ندی میں گر گیا تھا۔ اس کے اگلے پیر اور گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کی ہڈی مہندی رنگ والی کھال کے نیچے کھسک گئی۔ اس سے خون رِس رہا تھا۔ اس کے دوسرے گھٹنے کی ہڈی مکمل طور پر جوڑ سے الگ ہوگئی تھی بس کچھ رگ و ریشے جو کہ اس کے جسم کے ساتھ آخری لمحے کی وفاداری نبھا رہے تھے اُسے پکڑے ہوئے تھے۔ اس کا ایک کھر اس کی ہڈی سے الگ ہوکر ٹوٹ گیا تھا اور باہر نکل آیا تھا اور گھسی ہوئی نعل کے دو تین کیلوں کے دانے اس پر نظر آرہے تھے۔

ندی کا پانی یخ بستہ تھا۔ صرف گھوڑے کے جسم کی حرارت نے اس کے چاروں طرف کے پانی کو پگھلا دیا تھا۔ اس کا پورا جسم خون آلود کیچڑ میں پڑا ہوا تھا۔ وہ لگاتار سانس لے رہا تھا۔ اس کے ناک کے نتھنے کھل بند ہو رہے تھے۔ اس کی آدھی زبان اس کے دانتوں کے درمیان سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کے منھ کے چاروں طرف خون آلود جھاگ دکھائی دے رہا تھا اور اس کے گردن کے بال جو اس کے پیشانی پر پڑے ہوئے تھے، اس کے غم و اندوہ کو آشکار کر رہے تھے۔

دو جھاڑو لگانے والے اور ایک سڑک پر کام کرنے والا مزدور جس کا لباس ملٹری والوں جیسا تھا جس پر کوئی فیتہ نہیں تھا اور سروس کیپ بغیر کنارے والی یعنی گول ٹوپی پہنے ہوئے تھا، وہ تینوں چاہتے تھے کہ اس گھوڑے کو ندی سے باہر لے آئیں۔ ایک صفائی خدمتگار جس کے ہاتھوں میں گہری مہندی لگی ہوئی تھی، وہ بولا:

''میں اس کی دُم پکڑ لیتا ہوں اور تم لوگ اس کے پاؤں، اس کے بعد تینوں یک لخت گھوڑے کو اٹھالیں گے۔ بے چارے گھوڑے کو درد کی تاب نہیں ہے۔ وہ اپنے پیروں کو زمین پر نہیں رکھ سکتا ہے، اس لیے فوراً اٹھ جائے گا۔ تم لوگ اس کے پیروں کو اور میں اس کی دُم کو فوراً چھوڑ دوں گا تو گھوڑا اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے گا۔ اس کا دوسرا پیر زیادہ ٹوٹا ہوا نہیں ہے۔ یہ کیسا المیہ ہے کہ ایک پرندہ اپنے دو پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے، لیکن یہ گھوڑا اپنے تین پیروں پر بھی نہیں۔''

ایک آدمی جس کی بغل میں ایک کتھئی رنگ کا بیگ تھا اور رنگین چشمہ لگائے ہوئے تھا، وہ بولا:

''ایسے کیسے گھوڑے کو باہر نکالیں گے.....تم لوگوں کے علاوہ اور آدمی بھی چاہئے جو اس کے پورے جسم کو اٹھا سکے اور اسے فٹ پاتھ پر رکھ سکے۔''

ایک تماش بین نے جو کہ ایک چھوٹے بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا، غصے سے کہا:

''یہ بے زبان جانور...... بیچارہ گھوڑا...... اب کسی کام کا نہیں، اس کو ایک گولی سے ختم کر دینا چاہیے۔''

اس کے بعد اس نے ایک مفلوک الحال مسکین صورت والے کانسٹبل کی طرف دیکھتے ہوئے جو فٹ پاتھ پر کھڑا پکا ہوا چقندر یا شکرقندی کھا رہا تھا، کہا:

''پولیس والے صاحب! آپ کے پاس پستول ہے، کیوں اس کو اس اذیت سے نجات نہیں دلا دیتے۔ اسے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔''

کانسٹبل نے جو کہ شکرقندی کھانے میں مصروف تھا اور اس کا منھ شکرقندی سے بھرا ہوا تھا، تمسخر سے بولا:

''جناب! آپ نے خوب کہی، مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ گولی گھوڑے کے لیے نہیں ہے یہ چوروں کے لیے ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل میں اس گھوڑے کو راحت دے دی، اس کی جان چھڑا دی تو کل سرکار کو کیا جواب دوں گا۔ قیامت کے روز سوال و جواب کو بھی جانے دیجیے، کیا سرکار مجھ کم بخت سے نہیں پوچھے گی کہ تم نے گولی کا کیا کیا۔''

ایک سید صاحب پگڑی والے جنھوں نے ایک بوسیدہ پھٹی پرانی شال کاندھوں پہ ڈال رکھی تھی، بولے:

''ارے یہ کیسی باتیں کر رہے ہو...... یہ تو دوا کی ایک گولی سے کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔''

تب ہی ایک اور تماش بین جو کہ ہاتھ میں اخبار لئے ہوئے تھا، وہاں پر آ گیا اور پوچھنے لگا: ''کیا ہوا......؟''

ایک آدمی جو پائپ پی رہا تھا، بولا:

''میں اس محلے کا نہیں ہوں، بس یہاں سے گزر رہا تھا۔''

شکرقندی بیچنے والے نے جو اپنے گاہکوں کے لیے شکر قندی بغیر دستے کی چھری سے چھیل رہا تھا جواب دیا:

''گھوڑا کسی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا اور ایک دم گر گیا۔ بیچارہ بے زبان جانور صبح سویرے سے اب تک پانی میں پڑا ہوا ہے اور جان دے رہا ہے۔ کسی کو اس کی فکر نہیں۔ اس کو......'' پھر شکرقندی والے نے اپنی بات کاٹ کر گاہک سے کہا:

''ایک پیسہ ہو گیا'' اور اس کے بعد زور سے آواز لگانے لگا:

''بغیر ٹوکن والا قند ہے......ایک سیر، ایک پیسہ میں......''

اس شخص نے جس کے ہاتھ میں اخبار تھا، دوبارہ پوچھا:

''کیا اس گھوڑے کا کوئی مالک نہیں ہے۔''

ایک اور لمبا اور موٹا سا آدمی بھی جس نے چمڑے کا کوٹ پہن رکھا تھا اور ایک ہرے رنگ کی شال یا مفلر گردن کے گرد لپیٹے ہوئے تھا اور جس کی شکل کنڈکٹر سے مشابہ تھی، کہنے لگا:

''کیا کوئی اس کا مالک نہیں ہے یہ کسی کا تو ہوگا۔ اس کی کھال کی قیمت ہی کم سے کم پندرہ تومان ہوگی۔ تانگے والا ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو یہیں تھا۔ غالباً وہ اپنے تانگے کو کہیں رکھنے کے لیے گیا ہوا ہوگا۔ واپس آ جائے گا۔''

ایک چھوٹے بچے نے جو ایک آدمی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ سر اٹھا کر پوچھا: ''بابا...... جان تانگے والا اپنا تانگہ کیسے لے گیا ......اس کا گھوڑا تو مر گیا ہے؟''

عینک لگائے ایک سوٹ بوٹ والے صاحب نے پوچھا:

''کیا صرف اس کا ایک ہی پیر ٹوٹا ہے؟''

اس شخص نے جو پائپ پی رہا تھا اور جس کی شکل شوفروں جیسی تھی اور ہری شال گردن میں لپیٹے ہوئے تھا بولا: ''تانگے والا تو کہہ رہا تھا کہ اس کی پہلو کی ہڈیاں بھی ٹوٹ گئی ہیں۔''

گھوڑے کے نتھوں سے گرم گرم سانس نکل رہی تھی اور اس کے تمام بدن سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور اس کی پسلیاں اس کی کھال کے نیچے سے نظر آ رہی تھیں اور اس کے کولھوں پر پانچ انگل کیچڑ خشک ہو گئی تھی۔ گردن پر اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی کیچڑ لگی تھی اور کئی جگہوں سے اس کے جسم سے کھال اُڑ گئی تھی۔ اس کا جسم شدت سے لرز رہا تھا۔ وہ بالکل بھی چیخ نہیں رہا تھا، فریاد نہیں کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ پرسکون اور بے التماس تھا۔ ایک مکمل سالم گھوڑے کا چہرہ! وہ کھلی اور بے اشک خشک آنکھوں سے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ❁❁

ارشد منیم
Madina Basti, Raikot Road, Maler Kotla, Punjab-148023 (Mob.9417159225)

سکھ

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بارش کی پیشینگوئی کر رہے تھے۔

سچن، پونم کے گھر کے سامنے کھڑا کافی دیر سے اس کا منتظر تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے پونم کو فون پر اپنے آنے کی اطلاع دی تھی، مگر پونم تھی کہ گھر سے باہر نکلنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی، حالاں کہ پونم نے اسے اندر آنے کے لئے کہا تھا، مگر سچن نے باہر کھڑے رہ کر ہی اس کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ سچن نے بیتابی کے عالم میں اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور جھنجھلا کر ہاتھ میں پکڑے موبائل پر پھر سے پونم کا نمبر ملا لیا۔

''پونم جلدی کرو یار......ایک تو پہلے ہی لیٹ ہیں اوپر سے تم ٹائم ویسٹ کئے جا رہی ہو......''

تھوڑی دیر بعد پونم گھر سے باہر نکلی اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سچن کے قریب پہنچ کر مسکرا کر بولی:

''تھوڑا صبر تو کرو یار......آ تو رہی ہوں میں ......تم نے تو بس یونہی شور مچا دیا۔''

''شور مچانے والی بات ہی تو ہے......ایک تو پہلے ہی لیٹ ہیں اوپر سے تمہارا یہ میک اَپ......اگر بس نکل گئی تو......؟''

سچن کچھ خفا سا ہو کر بولا۔

''اچھا بابا سوری ......اب چلنا ہے کہ نہیں......؟ بتاؤ اب کون ٹائم ویسٹ کر رہا ہے۔؟''

پونم نے مسکرا کر کچھ اس ادا سے کہا کہ سچن کا غصہ پل بھر میں غائب ہو گیا۔ اس نے پونم کے ہاتھ میں پکڑے بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا:

''اس میں کیا ہے......؟''

پونم چہکتے ہوئے بولی:

''اس میں دفتر کے کاغذات اور میرے کپڑے بھی ہیں۔''

''ارے بابا...... کپڑوں کی کیا ضرورت تھی۔ ایک دن کے لئے تو ہم جا رہے ہیں۔ امید ہے شام تک واپس آ جائیں گے۔''

''مائی ڈیئر سچن اتنا لمبا سفر اور وہاں جا کر بھی بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی، جس وجہ سے یہ کپڑے میلے ہو جائیں گے......واپسی پہ صاف کپڑے پہنوں گی۔''

سچن یہ سن کر مسکرا دیا اور دونوں بس اسٹینڈ کی طرف چل دیئے۔ وہ دونوں سرکاری ملازم تھے۔ سچن کا تبادلہ تقریباً ایک مہینہ پہلے اس شہر میں ہوا تھا۔ جوائنگ والے دن ہی وہ پونم کی خوبصورتی پر مر مٹا تھا۔ شوخ چنچل، ہر ایک سے ہنسی مذاق کرنے والی پونم بھی پہلی نظر میں سچن پر اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔ ان دونوں کے پیار کو ان کے گھر والوں نے بھی منظوری دے دی تھی۔ منگنی کے بعد شادی کے لئے پانچ چھ مہینے کا وقت مقرر کیا تھا۔ آج دونوں کو محکمہ کی طرف سے کسی سلسلہ میں ایک دن کے لئے قریب کے شہر جانا تھا، جس کے لئے انہوں نے بس کے سفر کو مناسب سمجھا۔ ان کے لئے محکمہ کی طرف سے اس شہر کے ہوٹل میں کمرہ بھی بک کروا دیا گیا تھا۔

بس اسٹینڈ پہنچتے ہی ان کو بس چلنے کے لئے تیار کھڑی ملی۔

سچن بس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا:

''لو، اگر کچھ منٹ اور لیٹ ہو جاتے تو یہ بس نکل چلی تھی۔''

پونم اس اس کے پیچھے تیز تیز چلتے ہوئے بولی۔

''ہاں......یہ تو ہے......!''

بس میں بھیڑ کم ہی تھی، جس وجہ سے انہیں سیٹ آسانی سے مل گئی اور کچھ پل کے بعد ہی بس اپنی منزل کی طرف بڑھ گئی۔ دونوں باہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے باتوں میں مشغول سفر کا لطف لے رہے تھے۔ راستہ میں آ رہی کئی عمارتوں کی جانکاری بھی پونم،

سچن کو دے رہی تھی۔ دو گھنٹے کا سفر کب ختم ہوا، پتہ ہی نہ چلا۔ بس رُکتے ہی وہ اپنا سامان اٹھا کر نیچے اترے اور اس ہوٹل کی طرف چل دیے جس میں ان کے لئے کمرہ بک تھا۔

ہوٹل کے کمرہ میں پہنچ کر انہوں نے چائے آرڈر کر دی۔ ویٹر کچھ دیر بعد چائے کے ساتھ ان کے سامنے حاضر ہوا۔ پونم چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولی:

''جلدی سے چائے ختم کرو، تاکہ ہم اپنا کام نپٹانے کے بعد رات ہونے سے پہلے ہی واپس اپنے گھر کے لئے نکل لیں۔''

سچن سر ہلاتے ہوئے بولا:

ہاں...... میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔''

چائے کا مزہ لیتے ہوئے وہ دفتر کی طرف سے دیے گئے کام کے بارے میں بھی بات کرتے رہے۔ چائے ختم کرنے کے بعد دونوں اپنے کام کے سلسلہ میں نکل گئے۔ فارغ ہوتے ہوتے شام ہوگئی۔ ادھر آسمان پہ کالی گھٹائیں چھا گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہوگئی۔ ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے دونوں پوری طرح بھیگ چکے تھے۔ سچن اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کا جائزہ لیتے ہوئے بولا:

''بارش بہت تیز ہے۔ اب واپس نکلنا تو ناممکن ہے، رات یہیں گزارنی پڑے گی۔ اس بارے میں، میں سر کو فون پر بتا دیتا ہوں۔''

اس کے پاس کھڑی پونم باہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی:

''لگتا تو یہی ہے...... چلو جو بھگوان کی مرضی......تم فون کرنے کے بعد فریش ہو جاؤ۔ میں بھی گھر فون کرنے کے بعد چینج کر لیتی ہوں، پھر کھانے کا آرڈر کریں گے۔''

اپنے آفیسر کو فون کرنے کے بعد سچن باتھ روم میں گھس گیا، کچھ دیر بعد جب وہ باہر نکلا تو اس کی نظر پونم پر پڑی جس کے کھلے بالوں میں پانی شبنم کے موتیوں کی طرح جھلک رہا تھا۔ سچن کے اندر ہلچل سی مچ گئی۔ کمرے کی مدھم سی روشنی میں پونم کی جوانی قیامت نظر آ رہی تھی۔

سچن کے اندر ایک طوفان سا اٹھ چکا تھا۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اس کے ماتھے پر ابھر آئی تھیں، سانسیں اکھڑنے لگی تھیں، گلا خشک ہونے لگا تھا۔ پونم بھی سچن کے اندر کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے پاؤں کے انگوٹھے سے فرش پر بچھے قالین کو کریدتے ہوئے مسکرا مسکرا کر آگ پہ تیل ڈالنے کا کام کر رہی تھی۔ باہر بارش بھی جوانی پر تھی، اچانک بادلوں میں بجلی کوندی اور پونم دوڑ کر سچن سے لپٹ گئی۔ سچن اسے اپنی بانہوں میں کستا چلا گیا اور دونوں کے جسم میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی۔ پونم تھوڑا جھجکی، لیکن سچن کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکی۔ سچن آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کی بکھری زلفوں کے ساتھ کھیلتی سچن کی انگلیاں اب پونم کے کندھوں پر اتر آئی تھیں۔ اس نے پونم سے پوچھا:

''ڈر گئی......''

''ہوں......''

صبح سچن نے دیکھا کہ پونم گم سم سی بیٹھی نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی ہے۔ سچن نے سوال کیا:

''کیا بات ہے پونم، اس طرح خاموش کیوں بیٹھی ہو؟''

''کچھ نہیں......'' پونم بجھی سی آواز میں بولی:

سچن نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے شرارت بھرے لہجہ میں پھر سوال کیا:

''کوئی بات تو ہے...... کیا وجہ رات کا......؟'' گردن جھکائے پونم نے مختصر سا جواب دیا۔

''ہوں......''

سچن پھر شرارتی لہجہ میں بولا:

''میری جان اس میں غلط کیا ہے۔''

پونم خاموش رہی۔ سچن اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے بولا:

''اچھا سوری یار...... میں نہیں جانتا تھا کہ تمہیں شادی سے پہلے یہ سب منظور نہیں، میں پاپا سے بات کروں گا تاکہ وہ ہماری شادی جلدی کروا دیں۔ اب مسکرا دو میری بھارتیہ ناری......''

اس کی بات سن کر پونم مایوس سی مسکراہٹ کے ساتھ اٹھی اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ کمرے کی چابی ہوٹل کے کاؤنٹر پر پکڑا کر وہ دونوں بس اسٹینڈ کی طرف چل دیے۔

بس اسٹینڈ پر کافی بھیڑ ہونے کے باوجود انہیں سیٹ حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ بارش کی وجہ سے درخت اور پودے دھلے ہوئے تھے۔ سڑک پر کہیں کہیں اب بھی بارش کا پانی جمع تھا۔ سچن

بس میں بیٹھا باہر کے نظاروں کا مزہ لے رہا تھا۔ درختوں پر آئی تازگی اور نکھار اسے اپنے آپ میں بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک شرارتی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگی۔ اس نے ترچھی نظروں سے پونم کی طرف دیکھا جواب بھی سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ سچن نے دل ہی دل میں بھگوان کا اس بات کے لئے شکرادا کیا کہ ایک ایسی لڑکی اس کی جیون ساتھی بننے جا رہی تھی، جو رات کے واقعہ کو اسی لئے برا مان گئی تھی کہ شادی سے پہلے یہ سب ٹھیک نہیں۔

بس رکتے ہی دونوں اپنے اپنے گھر کی طرف چل دیے، حالاں کہ سچن پونم کے گھر تک اس کے ساتھ چلنا چاہتا تھا، لیکن پونم کا موڈ دیکھتے ہوئے وہ ضد نہ کر سکا اور یہ سوچتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیا کہ شام تک اپنے آپ اس کا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔

گھر پہنچ کر بھی پوری رات کے مناظر سچن کے ذہن میں کسی فلمی سین کی طرح گردش کرتے رہے۔ اس کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اسے کافی تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے آفس میں واپس آنے کی اطلاع دے کر سچن نے تھوڑی دیر ستانا بہتر سمجھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے اچانک سچن کو نیند کی آغوش سے باہر لا کھڑا کیا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے گھڑی پر نگاہ ڈالی جو دوپہر کا ایک بجنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

''باپ رے...... دو گھنٹے ہو چلے ہیں مجھے سوتے ہوئے۔ سفر اور گزری رات نے تھکاوٹ کچھ زیادہ ہی کر دی جو اتنی گہری نیند آگئی......''

رات یاد آتے ہی اس کا دل ایک بار پھر مچل اٹھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل شور مچا رہی تھی۔

''اٹھاتا ہوں...... بابا......''

کہتے ہوئے وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ ریسیور اٹھا کر کان کو لگاتے ہوئے بولا:

''ہیلو......!''

ادھر سے آواز آئی۔

''سچن میں بول رہی ہوں پونم، تمہارے موبائل کا سوئچ آف آرہا تھا۔ اس لئے ٹیلی فون پر رنگ کی۔''

''ہاں میری جان ...... تھکاوٹ کی وجہ سے میں کچھ دیر سونا چاہتا تھا، اسی لئے موبائل بند کر دیا تھا۔ تم بتاؤ کیسی طبیعت ہے......؟ موڈ تو ٹھیک ہے، اب جناب کا......؟''

کہتے ہوئے سچن ہنس پڑا۔ پونم کی مایوسی بھری آواز آئی:

''گھر پہنچ کر میں بہت پریشان رہی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ بہت سوچ سمجھ کر میں نے تمہیں یہ کہنے کے لئے فون کیا ہے کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔''

یہ سن کر سچن حیران اور پریشان سا ہو کر بولا:

''کیا......؟ یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟ کچھ عقل ہے تمہیں......؟ اتنے بڑے فیصلہ کی وجہ......؟''

پونم کی طنز بھری آواز آئی:

''وجہ...... وجہ ہے رات......''

سچن اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''رات جو کچھ بھی ہوا۔ اس کے لئے میں تم سے معافی بھی تو مانگ چکا ہوں۔''

سچن پہلے میری پوری بات تو سن لو، رات جو کچھ بھی ہوا، اس سے میں نے ایک بات محسوس کی وہ یہ کہ تم مجھے شادی شدہ زندگی کا سکھ نہ دے پاؤ گے۔ آئی۔ ایم سوری...... تم فیل ہو گئے سچن......''

اس سے پہلے کہ سچن کچھ کہتا پونم نے فون کاٹ دیا۔ سچن کے ذہن میں پونم کے بول ''تم فیل ہو گئے سچن'' گونجنے لگے۔ اس کے تصور میں قائم پونم کی بھارتیہ ناری کی تصویر پرزہ پرزہ ہو کر بکھرتی چلی گئی اور اسے اپنا وجود دھرتی میں دھنستا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ❁❁

خصوصی توجہ طلب

اکادمی مجلّہ ماہنامہ ''زبان وادب'' کے بارے میں ساری معلومات کے لئے انچارج جناب محمد شاہد سے ان کے موبائیل 9897958115 پر نیز مسودات اور کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں انچارج جناب محمد تمنا سے ان کے موبائیل 9931606459 پر رابطہ کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

منظر عالم
Quazi Ahmad Degree College, Jalley, Darbhanga - 847302 (Mob. 9955822003)

دھوکے باز

اور ان دونوں نے آخر سماج کے بندھنوں کو توڑ کر سول میرج کر لی اور اسی دن رات کی ٹرین سے آگرہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

تاریکی کا دامن چیرتی ہوئی ٹرین چلی جارہی تھی پوری رفتار سے، انٹر کلاس کا وہ ڈبہ تقریباً خالی ہی تھا۔ دو چار مسافر تھے وہ بھی تھک کر نیند کی آغوش میں آرام کرنے لگے۔ اگر جاگ رہے تھے تو بس صبا اور طارق۔

طارق کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا اور صبا جیسے محو تھی جھلمل نکھری چاندنی میں۔ طارق کی تازہ کہانی ''سمندر کی آنکھ'' پڑھ چکنے پر ایک مست بھری انگڑائی لے کر اس نے کہا:

''اس چاندنی میں تمہاری کہانی ''سمندر کی آنکھ'' پڑھتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنی ہی کہانی ہے اور ہم دونوں اس کے کردار ہیں، مگر اس کا عنوان ''سمندر کی آنکھ'' کے بجائے کچھ اور ہونا چاہئے تھا۔''

طارق چونکا، لیکن صرف ''ہوں'' کہہ کر رہ گیا۔

''بتاؤ طارق، تم کیا سوچ رہے ہو......؟''

''کچھ نہیں......ایک کہانی کا پلاٹ سوچ رہا تھا۔''

''چھپاتے کیوں ہو طارق! تمہیں میری قسم......!''

''سوچ رہا تھا آگرہ پہنچ کر ہم ٹھہریں گے کہاں!''

''بس اتنی سی بات! تمہیں فکر مند دیکھ کر میں تو ڈر ہی گئی تھی، لیکن اس کے لئے اتنی فکر کیوں؟ دو چار دن جب تک شہر میں کوئی مکان نہ مل جائے، کسی مسافر خانہ ہی میں ٹھہر جائیں گے۔''

''وہ تو کرنا ہی ہوگا، اچھا اب رات بھیگ چلی ہے، سو جاؤ۔''

''اور تم عبادت کرو گے؟'' صبا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں پہرہ دوں گا۔'' طارق بھی مسکرا اُٹھا۔

صبا کی پلکیں جھک گئیں اور طارق نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

آگرہ پہنچ کر صبا اور طارق مرچنٹ سراج کے مسافر خانہ میں ٹھہرے۔ انہیں ایک اچھا سا کمرہ مل گیا تھا، اس طرح تین دن اس مسافر خانہ میں گزر گئے۔

مکان کی تلاش میں طارق سارا دن شہر کی خاک چھانتا، لیکن مکان تھے کہ چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی نہ ملتے، وہ پریشان ہو گیا، اتنا بڑا شہر اور ایک کمرہ بھی خالی نہیں، آخر کیڑے مکوڑوں کی طرح اتنے آدمی کہاں سے آ گئے یہاں۔ وہ دل ہی دل میں جھنجھلا کر رہ جاتا۔

اس دن شام کے وقت طارق ایک چوراہے سے گزر رہا تھا کہ یکا یک آواز آئی: ''ارے کہاں بھائی طارق......؟''

طارق نے مڑ کر دیکھا: ''اوہ، ارے قاسم تم؟''

''کہو، کیسے آ ٹپکے......بھئی خوب ہو تم بھی، اطلاع بھی نہ دی۔''

''کیا کروں بھائی بہت جلدی میں آنا پڑا۔''

''اچھا، یہ تو بتاؤ، یہاں کسی کی شادی میں آئے ہو یا پھر تاج محل دیکھنے کی غرض سے......؟''

''نہیں، اب یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔''

''واہ! تب پھر کیا کہنا بس اب چلے چلو میرے ساتھ......''

''میں مسافر خانہ ہی میں ٹھیک ہوں! قاسم۔''

''واہ، ہمارے رہتے ہوئے تم مسافر خانہ میں ٹھہرو گے!''

''قاسم میں تمہارے ہی گھر آتا، لیکن......''

''ارے، لیکن کیا؟''

''میں اکیلا نہیں ہوں۔''

''کیا مطلب......!''

''تمہاری بھابھی بھی میرے ساتھ ہیں۔''

''ہماری بھابھی!'' قاسم حیرت سے بولا۔ ''بھائی واہ! کب کر لی شادی! ہمیں خبر بھی نہ دی۔ دوستی کا حق تو خوب ادا کیا تم نے!''

''یہ سب بعد میں بتاؤں گا۔کوئی مکان خالی ہوتو دلا دو۔''

''ارے یار،مکانوں کو مارو گولی،تم سیدھے چلو میرے گھر، سارا بنگلہ خالی پڑا ہے۔ میں ہوں تمہاری بھابھی اور میری بہن روبینہ، تمہارے آجانے سے تمہاری بھابھی خوش ہوگی اور روبینہ بھی۔''

طارق اپنے دوست کے لئے بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا،لیکن قاسم کو بضد دیکھ کر اس کے گھر جانا ہی پڑا۔ ایک ہفتہ کے اندر قاسم کی مدد سے طارق کو چھوٹا سا،لیکن صاف ستھرا مکان مل گیا اور جلد ہی طارق ایک ہائی اسکول میں ٹیچر بھی ہوگیا۔ طارق کا رواں رواں جیسے قاسم کے احسان کے بوجھ سے دب گیا۔

قاسم جیسا دوست قسمت ہی سے ملتا ہے،طارق سوچتا،اس سے کتنی ہمدردی ہے قاسم کو،اس کے لئے کتنی محبت ہے قاسم کے دل میں۔قاسم سچ مچ کتنا اچھا ہے......کتنا نیک، دوستی کا دم بھرنے والے، کتنے دوست ہوتے ہیں،لیکن سچا دوست وہی ہے جو وقت میں کام آئے۔قاسم سچ مچ ایک بھائی سے بھی بڑھ کر نکلا۔ اگر قاسم نہ ہوتا، وہ اس کی مدد نہ کرتا تو اسے نہ جانے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔''

سوچتے سوچتے قاسم کو اپنی کالج کی زندگی کے دن یاد آجاتے۔ان دنوں طارق سیکنڈ ایر میں تھا۔سی ایم کالج کے ہاسٹل ہی میں قاسم سے اس کی جان پہچان ہوئی تھی اور پھر کچھ ہی دنوں کے بعد وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست ہوگئے۔

انٹر کا امتحان دے کر قاسم آگرہ لوٹ آیا تھا۔ طارق اس کالج میں پڑھتا رہا اور اس نے بی اے کرلیا،لیکن قاسم فیل ہوا۔اس کے بعد وہ دوسرے اور تیسرے سال بھی فیل ہوا۔آخر وہ تعلیم سے دست کش ہوگیا۔اس درمیان میں دونوں میں خط وکتابت کا سلسلہ تقریباً بند رہا۔ وہ ایک دوسرے کو بھول سے گئے تھے۔

جب آگرہ میں دونوں اچانک پھر ملے تو گویا سوکھی بیل دوبارہ ہری ہوگئی۔ طارق اور صبا جلد ہی قاسم کے کنبے میں اس طرح گھل مل گئے جیسے برسوں سے ساتھ رہے ہوں۔ قاسم طارق کو بھائی صاحب کہتا اور صبا کو بھابھی۔ وہ سب جیسے ایک ہی کنبے کے افراد تھے۔

اس طرح ہنسی خوشی میں ایک سال بیت گیا،لیکن اِدھر کچھ دنوں سے طارق صاف دیکھ رہا تھا کہ صبا کے چہرے پر جیسے سوچ کے بادل چھائے رہتے ہوں۔وہ صبا کو پھولوں کی رانی کی طرح کھلی دیکھنا چاہتا تھا،دھندلی شام کی طرح اداس نہیں۔صبا کی اداسی کا باعث زیادہ دنوں تک طارق سے چھپا نہ رہ سکا۔وہ سمجھ گیا کہ اس کی وجہ پیسوں کی کمی ہے۔

صبا بے انداز لاڈ و پیار میں پروان چڑھی تھی۔ابتدا ہی سے زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کی عادی تھی اور یہاں طارق کو جو تنخواہ ملتی وہ تو صبا کے سنگار کے لئے بھی کافی نہ تھی۔طارق ہر طرح صبا کو سکھی رکھنا چاہتا تھا۔ صبا کے ہونٹوں کی مدھر مسکراہٹ اس کی زندگی کی خوشی تھی، اس لئے اس نے کئی ٹیوشن لے رکھے تھے۔ٹیوشن کے بعد وہ رات رات بھر جاگ کر کہانیاں لکھتا،لیکن کہانیوں سے جو معاوضہ ملتا وہ بھی بڑھے ہوئے اخراجات کی آگ میں جل کر خاک ہوجاتا۔

اس دن،قاسم کی چھوٹی بہن روبینہ کی سالگرہ تھی،طارق اور صبا خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے۔صبا سوچنے لگی۔روبیہ کو وہ کون سا تحفہ دے،لیکن ادھر مہینہ ختم ہوچلا تھا اور پرس میں روپے بھی،لیکن صبا خالی ہاتھ تو جانہیں سکتی۔ روبیہ کو کوئی نہ کوئی تحفہ دینا ہی ہوگا۔ طے ہوا کہ اس بار سلک کی ایک ساڑی ہی دے دی جائے،دونوں بازار گئے، کسی طرح صبا نے ایک ساڑی پسند کی،لیکن قیمت پوچھی تو طارق کا سر گھومنے لگا۔ پانچ سو روپے، ہائے وہ کیسے خریدے اتنی قیمتی ساری۔ اس کے پاس تو صرف ایک سو پچیس روپے بچ رہے تھے۔اب کیا کرے وہ؟ادھر دوکاندار نے ساڑی پیک کر کے صبا کے سامنے رکھ دی۔

پانچ سو روپے کا بل طارق کے ہاتھ میں تھا۔وہ پریشان سا صبا کی طرف دیکھ کر بولا:''صبا......''اور صبا سمجھ گئی کہ بات کیا ہے۔

فوراً بات بناتے ہوئے اس نے کہا:''معاف کیجئے سیٹھ جی!ہم پرس گھر پر ہی بھول آئے۔کل اسے آکر لے جائیں گے۔''

اس سے پہلے کہ دوکاندار کچھ کہے، اچانک قاسم سامنے آگیا۔''پرس بھول گئیں۔تو کیا ہوا بھابھی......میرا پرس تو حاضر ہے۔ کہئے سیٹھ جی کتنے کا بل ہے؟'' طارق اور صبا چونک پڑے۔

''آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں رہنے دیجئے، ہم کل لے جائیں گے۔ایسی جلدی بھی تو نہیں ہے۔''

''آپ بھی کیسی پرایوں سی باتیں کرتی ہیں بھابھی!۔''

قاسم بولا''پیسے کہیں بھاگ جائیں گے کیا۔''

بل اسی وقت ادا ہوگیا۔ صبا اور طارق دیکھتے ہی رہ گئے ایک دوسرے کی طرف۔ گھر آتے ہی صبا بھڑک اٹھی۔''تم نے آج ساری عزت خاک میں ملادی۔ پیسے پاس نہیں تھے،تو......''

''مجھ سے سچ مچ بھول ہوئی صبا!''

صبا بڑبڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

''ٹن ——— ٹن ——— ٹن گھڑی کی آواز آئی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ طارق مضطرب سا صبا کے بستر کے قریب آیا۔ وہ بے سدھ سی سورہی تھی۔ ریشم ایسے سیاہ بالوں کی ایک لٹ جیسے اس کے منھ کو چوم رہی تھی۔ چاند کی روپہلی روشنی میں صبا کتنی خوبصورت معلوم ہورہی تھی۔ صبا کے سرہانے کھڑا وہ بہت دیر تک کھویا سا دیکھتا رہا۔

کھڑکی کھلی تھی۔ باہر چاند مسکرارہا تھا،ٹھنڈی چاندنی میں کائنات عروس نو سی معلوم ہورہی تھی!

طارق، صبا کو خوش رکھنے کے لئے ہزار کوشش کرتا ،لیکن صبا کی بے بسی اور بے اطمینانی بڑھتی ہی گئی،اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ طارق سے شادی کرکے اس نے ایک بھول کی ہے۔خوفناک بھول! وہ سوچتی طارق کے لئے اس نے کیا کچھ نہیں کیا! ماں، باپ دھن دولت سب کچھ ٹھکرادیا! لیکن......اوہ! طارق! کتنا بدل گیا ہے وہ بھی ایک ہی سال کے اندر اسے جیسے میری کوئی پرواہ نہیں۔ گھر تو جیسے کاٹنے دوڑتا ہے اسے! جب دیکھو باہر......رات گئے پر گھر بھی پہنچے تو قلم کاغذ لے کر جا بیٹھے میز پر اسے اپنا ہی خیال ہے،وہ بس نام چاہتا ہے،میری اب اسے پرواہ کیا؟ دن رات لکھنا،لکھنا! میرے ساتھ گھڑی بھر بات کرنے کے لئے بھی اس کے پاس وقت نہیں! کیا میں اس قدر حقیر ہوں؟

وہ روز بروز طارق سے دور ہٹتی گئی اور جتنا وہ طارق سے دور ہٹ رہی تھی اتنا ہی قاسم کے قریب آرہی تھی۔ اب اس کا زیادہ وقت قاسم کے ساتھ گزرتا تھا۔ طارق سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش تھا۔ اس روز''باغباں'' کا سیکنڈ شو دیکھ کر صبا جب لوٹی تو طارق سپنوں کی رنگین دنیا میں کھو چکا تھا۔ صبا نے زور سے کواڑ کو ڈھکیلا ۔ طارق چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ کمرے میں آکر اس نے بہت آہستگی سے کہا:

''اتنی رات کہاں رہیں صبا؟''

''فلم دیکھنے چلی گئی تھی۔'' بے رخی سے صبا بولی۔

''اکیلی ہی آرہی ہو؟''

''نہیں قاسم بھی تھا ساتھ میں۔''

''قاسم......!تم بتا کے جاتی تو کیا حرج تھا؟ دیکھو صبا! قاسم سے بچ کر رہنا مجھے اس پر اعتبار نہیں۔''

''اُف......تیرے دل میں کتنا پاپ ہے......''

''مجھے اس طرح برباد نہ کرو صبا۔''

صبا کا ہاتھ پکڑ کر طارق نے کہا۔

''برباد......ہاں تم یہی کہو گے! لیکن طارق،اپنے دل سے پوچھو......برباد میں نے تمہیں کیا ہے یا تم نے مجھے۔''

''قاسم نے تمہاری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے صبا! اب بھی ہوش میں آؤ!''

''میں بالکل ہوش میں ہوں اور میں تمہیں صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔'' اور دوسرے دن صبا سچ مچ طارق کو چھوڑ کر قاسم کے ساتھ کولکاتا چلی گئی۔

صبا کے جانے ہی سے طارق کی دنیا اُجڑ گئی۔ حسرتوں کا چراغ بجھ چکا تھا اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف اندھیرا! اس کی زندگی اس کے لئے جیسے ایک بوجھ بن گئی۔ ایسا بوجھ جس سے بار بار اس کی سانس رُکنے لگتی۔ وہ سوچتا،اپنا سب کھو کر بھی وہ کیوں زندہ ہے۔

ایڈیٹروں کے خطوط آتے، کہانیوں کی مانگیں آتیں،لیکن وہ ایک حرف نہیں لکھ سکتا جیسے صبا اپنے ساتھ اس کا سب کچھ لیتی گئی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ،اس کے حسین و رنگین تخیلات، اس کے مدھر گیت، سب کچھ!

اب اس کے لئے زندگی میں کوئی کشش نہ رہی۔ وہ گھنٹوں بیٹھا آسمان کی طرف دیکھتا رہتا، جیسے اس کی آخری آرزو تھی کہ اب آسمان پر ہی اس کا کھویا ہوا پیار اور سکون مل جائے۔ اس کی کھوئی ہوئی مسرتیں اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹیں مل جائیں۔ ❁❁

منظومات

وِشال کُھلّر
381-C, Rajguru Nagar, Ludhiana - 141012 (Mob. 9463681801)

نوائے رنگ

(ایک متوازی کردار سے مخاطب چند نظمیں)

(۱)

نوائے رنگ
جانِ من
کہاں کی تم بہشتی ہو
تمہیں تو سب ہنر آتے ہیں!
دنیا کو
پلک جھپکے
ندارد کر دیا تم نے!
جوانی زخم کا حصہ
دیا تو
وقت کیا دیکھا
چنا ہے عمر کا وہ پائداں
جس پر
قدم رکھتے ہوئے اکثر
طنابیں ٹوٹ جاتی ہیں

(۲)

نوائے رنگ!
سنتی ہو؟
تغافل کا کوئی پہلو
تمہارے کام میں آئے
زبس انکار کا مدھم
سریلا راگ چن لینا

تمہاری اک کلائی میں
جو چوڑی کھنکھناتی ہے
اُسے تم خواب بستر پر
ہمیشہ
ساتھ میں رکھنا!

کبھی جب مڑ کے دیکھیں گے
یہی سریاد آئیں گے

(۳)

نوائے رنگ!
بیٹھو تو
ذرا سی بات کرتے ہیں
اُداسی لہو کی صورت
تڑپتی آرزو میں
گنگناتی ہے

چلو آؤ
کسی خاموش سجدے میں
ابھی ہم سر جھکاتے ہیں
خدا کو جان دینی ہے
تو مل کر
مسکراتے ہیں......

(۴)

نوائے رنگ!
باتونی بہت ہو تم
کہاں خاموش رہتی ہو!
تمہاری چپ میں بھی تیور تمہارے
بول اُٹھتے ہیں
کبھی غصیائی نظروں سے
جو سورج دیکھ لیتی ہو
گھٹائیں ناز کرتی ہیں
بلا کی شوخ چالوں سے
تمہارا بتکدہ روشن
ازل کا میکدہ آباد!

(۵)

نوائے رنگ!
دیکھو تو
وہ اب بھی زخم تازہ ہیں
جنہیں تپتے دیئے کی لو میں
تم نے ہی جلا بخشی
ابھی امید کی باتیں
سلگتی ہے بجھے دل میں
ابھی تم آ بھی سکتی ہو!
کسی ویران شانے پر
تمہاری زلف کا سایہ
بکھر کر
زخم سارے بھر بھی سکتا ہے

❁❁❁

بنگلہ: نیریندرناتھ چکرورتی

اردو: نسیم عزیزی

172, G.T.Road (South) Howrah - 711102 (Mob. 8777329145)

بجائے اس کے

فائدہ کیا
اُنھیں جلاؤ تم
اِس سے بہتر کہ عمر بھر جیسے
رفتہ رفتہ سلگتے رہتے ہو
رات دن
تم کہ تنہا جلتے ہو!
جلتے جلتے سکڑتے ہی جاؤ
جیسے چہرے کا خول،
روز وشب
جتنے عرصہ نہ خون رِس جائے
خول چہرے کا
ایک دن بہہ کر
حسب دستور
رِس ہی جائے گا
اتنی مدت میں تم کرو گے کیا؟
دوڑتے بھاگتے پھروگے کیا؟
بھاگنے سے بھی فائدہ کیا ہے!

اس سے بہتر کہیں،
تمام حیات
جس طرح ہو
وہی تن تنہا
بیچ دنیا کے
یوں کھڑے ہو کر
رات دن
جلتے جاؤ اِس صورت
جلتے جلتے یوں ہی سکڑتے رہو
روز وشب، یعنی
یہ مقدر پھر
جب تک اپنا نقاب اٹھاتا نہیں
ایک دن، دفعتاً
اٹھے گا ضرور،
سامنے یہ نقاب قسمت کا!
......کیا کروگے
اگر نقاب اٹھا؟

خون آلودہ چہرہ، آنکھوں میں
لے کے ظلمت
اسے کہو گے کیا
اب مزید اور یوں نہ جلنا پڑے؟
ہرگز ایسی نہ کوئی بات کہو!
اس سے بہتر
فقط یہی بولو
دوسروں کو نہ میں جلایا کبھی
آپ جلتا رہا تن تنہا
یہی بہتر ہے
رکھ کے آگ پہ ہاتھ
ہاں، فقط اتنا کہنا چاہا تھا
ایک اک شے حسین ودل کش ہے
ہے مناسب......کہو،
کہ اس کے سوا
اور کچھ بھی نہ تم سے کہنا تھا!

فریدہ انجم

Tarni Prasad Lane, Near Chhoti Majid, Patna - 800008
(Mob. 8235851828)

ایٹمی آنکھیں

پرکشش ہیں بہت تری آنکھیں
خوب لگتی ہیں سرمئی آنکھیں
کھیل ، الفت کا کھیلتی آنکھیں
توبہ ، توبہ ، شرارتی آنکھیں
اس کی آنکھیں ہیں یا کٹاری ہیں
قتل کرتی ہیں ادھ کھلی آنکھیں
قصۂ عشق خود سناتی ہیں
نیند میں ڈوبی مدبھری آنکھیں
ہیروشیمائے دل نہ بچ پایا
اس کی آنکھیں تھیں ایٹمی آنکھیں
جس کو کہتے ہیں عنبر و شہلا
اصل میں ہیں یہ نرگسی آنکھیں
بھول پائے نہ آج تک ، انجم
نیلی نیلی ، وہ جھیل سی آنکھیں

❁❁❁

فراقؔ جلال پوری

Moh. Qazipura, P.o. Jalapur,
Dist. Ambedkar Nagar-224149 (Mob. 9758772746)

غزل

لپٹ لپٹ کے ہواؤں سے بار بار درخت
جتا رہے ہیں فضاؤں سے اپنا پیار درخت
وہ پھول چہرہ مری سمت جب بھی آتا ہے
تو جھومتے ہیں خیالوں کے خوشبودار درخت
اُسے بھی جنگ سگے بھائیوں کی لے ڈوبی
کھڑا ہوا تھا جو آنگن میں یادگار درخت
جو سخت ہوتے ہیں آندھی میں ٹوٹ جاتے ہیں
لچک ہو جن میں وہ ہوتے ہیں باوقار درخت
ہوا ہو ، دھوپ ہو ، آندھی ہو ، سنگ باری ہو
رُتوں رُتوں سے کریں گے نگاہ چار درخت
گیا ہے چھوڑ کے یہ کون اپنی یاد کی چھاؤں
بلا رہے ہیں اُسی کو ندی کے پار درخت
فراقؔ! امن و اماں کی بڑی ضرورت ہے
لگاؤ پیار محبت کے سایہ دار درخت

❁❁❁

شاہد اختر
Gaya College, Gaya - 823001 (Mob. 7488198832)

غزلیں

بیان ہونے سے قصہ ہی رہ گیا اپنا
زبان جم سی گئی لب نہیں کھلا اپنا

جدھر نہیں تھا رُخِ منزل سدا اپنا
ادھر بھی رنگ تماشا بکھر گیا اپنا

سجائے رکھتا ہوں گفت و شنید کا بازار
تمام گونجتا رہتا ہے قہقہہ اپنا

اسی کی آگ میں جلتا رہوں گا شام بہ شام
بجھا نہیں ہے ابھی شعلۂ نوا اپنا

اُجاڑ ہو گئیں لطف سخن کی انجمنیں
اب اس دیار میں کچھ بھی نہیں رہا اپنا

تری نگاہ نے ذرّے کو آفتاب کیا
وگر نہ دیدنی قصہ تمام تھا اپنا

یقیں سے کہہ نہیں سکتا کہ میں بھی ہوں موجود
مرا وجود سراسر ہے واہمہ اپنا

میں اپنے غم کو کھلونا بناکے کھیلوں گا
اگر کسی سے یہاں دل نہیں لگا اپنا

کسی سے کوئی توقع نہ باندھیے اختر
نہیں ہے کوئی جہاں میں بجز خدا اپنا

❁❁❁

کچھ پرانے واہمے میں کچھ نیا امکان ہے
ایک امکانِ سفر میں دوسرا امکان ہے

نامۂ اعمال اپنا جس قدر بھی ہو سیاہ
اس اندھیری شب میں روشن اک دیا امکان ہے

راستے میں دشت بھی آئے گا صحرا بھی مرے
خاک اڑانے کا ادھر باقاعدہ امکان ہے

ٹوٹنے والا نہیں شام و سحر کا سلسلہ
جلتا بجھتا سا چراغ نقش پا امکان ہے

میں بھی ایسی ٹوٹی پھوٹی ساعتوں سے صبح و شام
رائیگاں ہو جاؤں گا اس کا کھلا امکان ہے

خوش نہیں آتی ہے مجھ کو میری آشفتہ سری
یوں تو ہونے کو نگاہِ آشنا امکان ہے

سنتا رہتا ہوں لرزتے کانپتے لمحوں کا شور
کیسا میرے روبرو سہما ہوا امکان ہے

وہ بھی نکلے گا حصار تیرگی سے کوئی دن
میں بھی ہوجاؤں گا مثل آئینہ امکان ہے

آئینہ خانے میں اختر کچھ چمکتا ہی نہیں
چار دن کی زندگی میں اورکیا امکان ہے

❁❁❁

غزلیں

بے نام گیلانی

Katra Bagh, Nai Sarai, Bihar Sharif,
Nalanda- 803101 (Mob. 7632068339)

یہ حق ہے زمیں آسماں اور بھی ہیں
ہماری طرح کے کہاں اور بھی ہیں

سراپا تکبر ذرا تو بھی سن لے
تری زلف سے سائباں اور بھی ہیں

چمکتے ہیں خاک وطن کے یہ ذرّے
وطن سی کہاں کہکشاں اور بھی ہیں

ابھی سلسلہ کشت و خوں کا چلے گا
ابھی حادثے ناگہاں اور بھی ہیں

مری موت ہی آخری تو نہیں ہے
فسانے کئی بے زباں اور بھی ہیں

فقط چند قبروں پہ گل پوشی کیوں کر
یہاں مقبرے بے نشاں اور بھی ہیں

کمندیں تو ڈال آئے نجم و قمر پر
''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''

ڈاکٹر قدسیہ انجم علیگ

Saharanpur - 247001

سمجھوتے زندگی سے گئے جا رہے ہیں ہم
مجبوریوں کے ساتھ جئے جا رہے ہیں ہم

اب تو ہمارا اس سے کوئی رابطہ نہیں
پھر بھی اسی کو یاد کئے جا رہے ہیں ہم

مر کر سکون مل سکے ، اس ایک امید میں
خاموشیوں سے اشک پئے جا رہے ہیں ہم

یاد غم فراق میں جیتے ہیں اس طرح
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہے ہیں ہم

اب اس سے بے وفائی کا شکوہ فضول ہے
یہ سوچ کر ہی ہونٹ سئے جا رہے ہیں ہم

یہ آنسو دل کے زخم یہ غم اور حسرتیں
انجمؔ سب اپنے ساتھ لئے جا رہے ہیں ہم

مظہر مجاہدی

Mojahidpur (west) House No. 17, Bhagalpur 812002 (Mob. 7643053862)

غزلیں

غریب شہر کی بس جاں فشانیاں پڑھنا
امیر شہر کی مت لن ترانیاں پڑھنا

تمہارے نام سے منسوب شاعری ہے مری
غزل میں میری ، تم اپنی کہانیاں پڑھنا

ملے جو شہر کے مصنوعی حسن سے فرصت
تو میرے گاؤں کی پیاری جوانیاں پڑھنا

فسردہ چہرے کی تحریر کیا پڑھے گا وہ
اُسے تو آتا ہے بس شادمانیاں پڑھنا

یہ ڈائری ، یہ کتابیں ، یہ بکھرے بکھرے شعر
ہمارے بعد ہماری نشانیاں پڑھنا

جمی جو پپڑیاں کھیتوں کے لب پہ ہیں مظہر
سلگتی رُت کی انہیں مہربانیاں پڑھنا

❁❁❁

صفائی اور شواہد سے میلوں دور ہوں میں
مرا قصور یہی ہے کہ بے قصور ہوں میں

کہو غموں سے وہ آکر ذرا سمیٹیں مجھے
نشاط و عیش و مسرت سے چور چور ہوں میں

یہ حسن و عشق کہے ایک دوسرے سے یہی
مرا غرور ہے تو اور تیرا غرور ہوں میں

تمہارے لب پہ نہیں ہوں مجھے پتہ ہے ، مگر
تمہارے خانۂ دل میں کہیں ضرور ہوں میں

نئی ہوائیں تلی تھیں جسے بجھانے کو
اُسی چراغ کہن کا حسین نور ہوں میں

وہ آگہی کی مری آج کھا رہا ہے قسم
سمجھ رہا تھا مجھے جو کہ بے شعور ہوں میں

نہیں ہیں ویسے تو اعمال پھر بھی اے مظہر
بہشتی باغ ہیں میرے ، برائے حور ہوں میں

❁❁❁

اشعارِ زیبا

نگاہِ مست وہاں لے گئی محبت کو
جہاں کا ہوش و جنوں کو سراغ بھی نہ ملا (فراق گورکھپوری)

پہنچا ہے یہ کہاں تک آیا ہے یہ کہاں سے
اندازۂ سفر کر رفتارِ کارواں سے (سیماب اکبرآبادی)

اُٹھانا بارِ امانت کا کام مشکل ہے
کسی کا ہو نہ زمانے میں رازداں کوئی (سالک لکھنوی)

حقیقت ہے خود محو نظارہ بازی
کرامات حسن مجازی تو دیکھو (عطا کاکوی)

ہنؔر رسول پوری

M.K.Art, Opp. Nizari Restaurent, Bhendi Bazar Signal, E.R. Road,

Mumbai- 400008 (Mob. 7718937729)

غزلیں

زندگی امتحان ہے میری
آزمائش میں جان ہے میری
چھو رہا ہوں میں آسمانوں کو
کتنی اونچی اُڑان ہے میری
تو نے صیاد جس کو قید کیا
اس پرندے میں جان ہے میری
جس میں توحید کا تقدس ہے
وہ صدا ، وہ اذان ہے میری
اپنا اپنا ہنؔر دِکھانا ہے
تیر تیرا ، کمان ہے میری

❁❁❁

دِن جو آئے گردشِ ایام کے
حوصلے دیکھے دلِ ناکام کے
مجھ کو ڈر ہے جان نہ لے لیں میری
پر فسوں سائے گھنیری شام کے
مضطرب ، حیراں ، پریشاں ، غم زدہ
نام کتنے ہیں دلِ ناکام کے
ایک مفلس سوچتا ہے رات دِن
جانے کب آئیں گے دِن آرام کے
لوگ کہتے ہیں جسے جانِ چمن
ہم تو عاشق ہیں اسی گلفام کے

❁❁❁

رباعیاتِ
ولی الرحمٰن ولؔی

اُس وقت کی کچھ عجیب حالت ہوگی
دیدارِ جمال کی نہ طاقت ہوگی
بہتر ہے کہ پردے میں رہے وہ پردہ نشیں
بے پردہ ہوا تو بس قیامت ہوگی

❁❁❁

تربت پہ وہ آئے دل دُکھانے کے لئے
رونے کے لئے اور رُلانے کے لئے
کس گوشۂ عزلت میں چھپوں میں جا کر
آ پہنچے یہاں بھی اب ستانے کے لئے

❁❁❁

مر کر بھی کسی کی جستجو باقی ہے
ملنے کی ہنوز آرزو باقی ہے
مٹی ہے ہماری اس گلی میں برباد
گو خاک ہوئے عشق کی بو باقی ہے

کلیم سہسرامی

"Maimuna Manzil" Old Azimabadi Colony, Patna - 800006 (Mob. 9504751737)

غزلیں

ہر خوشی کا اور غم کا ، مسئلہ مٹی میں ہے
درحقیقت زندگی کا مرحلہ مٹی میں ہے

میں فقیری میں بھی زندہ ہوں اگر تو مست ہوں
تاج پوشی سے کہیں زیادہ مزا مٹی میں ہے

ہم زمانے کو وفا کا درس دے آئے مگر
خود ہماری ہی وفاؤں کا صلہ مٹی میں ہے

میرے سینے میں جو دل ہے یہ بھی ہے خود سر بڑا
اس کے آگے دشمنوں کا حوصلہ مٹی میں ہے

میرے بچپن کی کوئی یادیں جدا ان سے نہیں
میرے بچپن کا کھلونا بھی دبا مٹی میں ہے

جب کسی نے پوچھ ڈالا وہ مرے گھر کا پتہ
مسکرا کے میں نے اس سے کہہ دیا مٹی میں ہے

میں بھی بازارِ ہوس میں بک گیا ہوتا کلیمؔ
خیر کہیے کہ صداقت کا نشہ مٹی میں ہے

❁❁❁

بس اسی نسخے میں تیری کامرانی قید ہے
اس میں برسوں سے مری شعلہ بیانی قید ہے

کیا عجب ہے زندگی کی جو کہانی قید ہے
سن مجھے اے دوست ، میری ترجمانی قید ہے

اب کفِ افسوس ملنے سے بھی کچھ حاصل نہیں
میں نے سمجھایا تھا ، یہ دنیائے فانی قید ہے

اے مرے ہمراز زخموں کو مرے اب نہ کرید
چشمِ زنداں میں ابھی اشکوں کا پانی قید ہے

اب سنبھالے رکھنا اس کو ہو گیا مجھ سے محال
کیا کروں اس کا جو تیری اک نشانی قید ہے

ہو گئے آزاد رسم و راہ سے دونوں مگر
دل کی زنجیروں میں تو اب بھی دوانی قید ہے

یہ کسی صورت مجھے تھکنے نہیں دیتی کلیمؔ
ذہن میں اک بات جو برسوں پرانی قید ہے

❁❁❁

ابیاتِ زیبا

اللہ رکھے اُس کا سلامت غرورِ حسن
سوز و گداز عشق سے دم پر بنی رہے

کھل گئی چشم بصیرت خاک میں ملنے کے بعد
دل میں نہیں تو ذکر بھی اُس کا گناہ ہے

آنکھوں کو جس نے دی ہے سزا انتظار کی (آغا حشر کاشمیری)

دل کی لگی رہے تو بڑی دل لگی رہے (حسرتؔ عظیم آبادی)

دل کے ہر ذرّے میں اک دنیا نظر آئی مجھے (بسملؔ الہ آبادی)

آیا زباں پہ نام تو یہ بھی قصور تھا (کیفؔ)

غزلیں

غیاثؔ احمد شہودی

LIG-51, Serampore Housing, Estate, Rishra-712248
Hooghly (West Bengal) (Mob. 9903760094)

آپ کے دل سے ملے دل تو کوئی بات بنے
طے کرے عشق مراحل تو کوئی بات بنے
ہر قدم چلنے میں در پیش پریشانی ہے
سہل کر لوں رہِ مشکل تو کوئی بات بنے
کامیابی کی ضمانت ہے کشادہ نظری
اپنا دل ہو متحمل تو کوئی بات بنے
باندھ کر اپنی کمر کب سے محاذ آرا ہوں
آئے اغیار مقابل تو کوئی بات بنے
تیری حسرت نے سکھایا مجھے دنیاداری
وصل نکلے متبادل تو کوئی بات بنے
دور اندیش مسافر کی طرح سوچتا ہوں
خود پکارے رہِ منزل تو کوئی بات بنے
گردشِ وقت نے طوفان اٹھا رکھا ہے
ناؤ پہنچے لب ساحل تو کوئی بات بنے
پاؤں آزاد نہیں ہیں رہِ ہستی میں غیاثؔ
توڑدوں غم کے سلاسل تو کوئی بات بنے

❁❁❁

مظہرؔ زاہدی

Alamganj, Loharwa Ghat Lane, Patna - 800007
(Mob. 9934410620)

دل پہ غفلت نے رکھ دیا ہے پہاڑ
سجدہ کرنا بھی ہوگیا ہے پہاڑ
آیئے حالِ دل سناتے ہیں
تاب جس کی نہ لا سکا ہے پہاڑ
ہم نے دل میں بسا رکھا ہے جسے
اس کے جلوؤں سے جل اُٹھا ہے پہاڑ
مجھ کو وارفتگی میں کب تھا دماغ
راہِ الفت میں کب ملا ہے پہاڑ
وقت کٹتا نہیں امیدوں کا
کاٹنا اس کا اب ہوا ہے پہاڑ
جوش میں ابر کب تو آئے گا
برق گرنے سے جل رہا ہے پہاڑ
عشق کے معجزے کا ہے یہ کمال
سر پہ مظہرؔ نے رکھ لیا ہے پہاڑ

❁❁❁

شکیلؔ ہاشمی

Sulemanganj, Sasaram, Rohtas - 821115 (Mob. 6206432168)

غزلیں

پھول خوشبو رُت سہانی جائے گی
زندگی کی ہر نشانی جائے گی

چھین لے گا وقت آنکھوں کا شباب
اور لبوں سے خوش بیانی جائے گی

کب کرو گے ایک دوجے پر یقین
کب دلوں سے بدگمانی جائے گی

اب نہ رکھا جائے گا اپنا لحاظ
اور نہ کوئی بات مانی جائے گی

جس قدر بھی ہے غنیمت جانئے
اب تو یہ رُت بھی سہانی جائے گی

غرق ہو جائے گا کشتی کا وجود
جب ادائے بادبانی جائے گی

فکر و فن بیدار ہوں گے جب شکیلؔ
تیرگی کی حکمرانی جائے گی

❁❁❁

پھولوں کی وادیاں ہوں یا رستے ہوں خار کے
رکئے گا کبھی راہ میں ہمت نہ ہار کے

اب تک خزاں کی قید سے باہر نہ آسکا
مدت سے دیکھتا تھا جو سپنے بہار کے

لمحے سبھی حیات کے میرے خلاف ہیں
پر حوصلے جواں ہیں ابھی اعتبار کے

چلئے اب ایسے راستے کی جستجو کریں
جس راستے پہ کھلتے ہوں پھول افتخار کے

ہر سمت خواہشوں کا مچلتا ہجوم ہے
لمحے بکھر کے رہ گئے قول و قرار کے

برہم شکیلؔ کیوں رہے ان کے وجود سے
ذرّے ہیں وہ بھی گلشن ناپائیدار کے

❁❁❁

رباعیات
رساؔ ہمدانی

بے پردہ اگر وہ فتنہ قامت آئے
ذہن و خرد و ہوش پر آفت آئے
ہو جائے وہ ناز سے خراماں جو رساؔ
کل کے عوض آج ہی قیامت آئے

❁❁❁

جاتی رہی دل سے آشنائی کی ہوس
چپ ہوں کہ نہیں ہے خوش نوائی کی ہوس
اب میرا قفس ہے آشیاں اے صیاد
اب مجھ کو نہیں رہی رہائی کی ہوس

احمدؔ اسلم

Quazi Mohalla, Sherghati, Dist. Gaya (Mob. 9934463434)

غزلیں

وہ ولولہ وہ جوش وہ ہمت وہ ہنر لا
جو ظلم کے آگے نہ جھکے پھر وہی سر لا
مانا کہ نہیں طاقت پرواز مگر لا
اے طائر لاہوت وہی بازو و پر لا
ٹھہرے ہوئے دریا کو تلاطم کی ہوا دے
سوکھے ہوئے اشجار میں پھر برگ و ثمر لا
اک پل کو نہیں چین ہے اے بادِ صبا سن
جا کوچۂ جاناں سے ذرا اُن کی خبر لا
احمدؔ پہ بھی بس ایک عنایت کی نظر ہو
کب میں نے کہا تو میرے لئے لعل و گہر لا

❁❁❁

مری جاں گئی ، مرا گھر لٹا ، کہاں اس کا مجھ کو ملال ہے
یہ خطائیں بھی گئیں اپنے سر اور ہمیں سے الٹا سوال ہے
تری سب ادائیں ہیں فتنہ گر ، ترا حسن بھی بے مثال ہے
مری بات سن مرے ہم نشیں جو عروج ہے تو زوال ہے
یہ جو پر ملے ہیں نئے نئے ، انہیں آندھیوں سے بچا کے رکھ
کبھی عرش پر ، کبھی فرش پر یہ ہوا کا ادنیٰ کمال ہے
تری عظمتوں کا ہو ذکر کیا ، تری رفعتوں کا پتہ کسے
ہر اک جہان کی رونقیں ترا ایک عکس جمال ہے
جہاں بزم سجتی تھی دل نشیں ، جہاں لوگ رہتے تھے با وفا
وہ جو شہر تھا کبھی جاں فزا ، وہاں سانس لینا محال ہے

❁❁❁

رباعیات زیبا

منزل کی خبر نہیں ، منزل کی نہ پوچھ
ساحل کا پتہ نہیں ، ساحل کی نہ پوچھ
اے قیس بھٹکتا ہے کہاں صحرا میں
لیلیٰ ہے ترے دل ہی میں محمل کی نہ پوچھ
(ثمر لاہوری)

رنگینیٔ دُنیا کا فسانہ کیا ہے؟
خاموشیٔ فطرت کا ترانہ کیا ہے؟
موجودہ زمانے میں ہوں بھی لیکن
اب تک نہیں سمجھا کہ زمانہ کیا ہے؟
(بدیع الزماں قمر)

ہستی کی یہ تصویر بدل جائے گی
ساعت غم ایام کی ٹل جائے گی
ہر چیز کا اک وقت ہوا کرتا ہے
مرنے کی تمنا بھی نکل جائے گی
(نعیم ندوی)

جب سے کوئی محو چمن آرائی ہے
دلہن کی طرح فصل بہار آئی ہے
شاخوں کے لچکنے سے ہے ظاہر ساقیؔ
ہر گل کے لئے حکم جبیں سائی ہے
(ساقیؔ صدیقی)

نام کتاب	:	سفر ہے شرط (سفرنامہ)		
مصنف	:	سرورغزالی		
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی		
اشاعت	:	۲۰۲۴ء		
صفحات	:	۲۱۶	قیمت :	۳۰۰ روپے
مبصر	:	**ڈاکٹر شاھد جمیل**		

سرورغزالی کے مجموعہ سفرنامہ ’’سفر شرط ہے‘‘ کے دورانِ مطالعہ فرطِ انبساط میں یہ کلمہ تحسین منھ سے کود پڑا تھا کہ یہ سفرنامے معلومات افزا ڈاکومنٹریفلم جیسے ہیں، جووقت قرأت لطف نظارہ اور حصولِ علم وآگہی سے مسرور ومحظوظ کرتے ہیں۔

رودادِ سفر اور سفرنامے یکساں نہیں ہوتے۔ رودادِ سفر، فقط ایک سرسری بیان ہوتا ہے، جس میں راوی بغیر ترتیب وضابطہ، سفر کی سہولت وصعوبت، ذاتی محسوسات ومشاہدات اور حصولیابیوں کو بیان کردیتا ہے، لیکن ایک سفرنامہ نگار سیاح کا مطمح نظر سیاحت کے ساتھ مقامِ سیاحت کے متعلق زیادہ سے زیادہ دریافت اور معلومات کا حصول اور اُن کا فنی پیرائے میں اظہار وبیان ہوتا ہے، لہٰذا سفرنامہ نگار کا تجسس اور اس کی طلب جویائی ہمہ وقت اُس سے دوقدم آگے آگے چلتی ہیں۔ وہ منصوبہ بند طریقے سے آغازِ سیاحت کرتا اور وقت واخراجاتِ سفر کو مانند ایندھن استعمال کرتا ہے۔ وہ تھکانِ سفر اور خطروں کی پرواہ کئے بغیر دشوارترین مقامات تک جاپہنچتا ہے۔

اُس میں کولمبس جیسا جنون اور جرأت رندانہ بھی ہوتا ہے۔ دورانِ سفر اُس کی چاہت اور بیقراری قابل دید ہوتی ہے۔ وہ اپنے مطالعے اور علم کی بنیاد پر سیاحتی مقامات کو اپنی نظر، نظریے اور مخصوص زاویوں سے بھی دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ وہ اپنے گائڈ اور مقامی اشخاص سے مشہور ومشتہر اور روایتی باتوں کو بھی سنتا اور سیاحتی مقامات کے متعلق تاریخی وتہذیبی اور منسوبہ ومشتہر معلومات ونکات کی حسب استطاعت تحقیقات کرتا اور اپنے علم اور مشاہدات کو مع جزئیات ذہن اور نوٹ بک میں بھی محفوظ کرتا جاتا ہے، پھر وہ ماخوذ واندوختہ معلومات اور اپنے محسوسات ومشاہدات کو فنی پیرایۂ بیان میں پیش کرتا ہے۔ اُس کا دلکش اندازِ پیشکش قاری کے لئے مانند زادِراہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی سفرنامے کی قرأت کرتے وقت قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ سفرنامے کو پڑھ نہیں رہا ہے بلکہ وہ سیاح کا ہم سفر اور ناظر مقام بھی ہے۔ سرورغزالی کے سفرناموں کی قرأت کے وقت مجھے ایسا ہی محسوس ہوا اور مجھ پر اِس امر کا اعتراف لازم ہوگیا کہ سرورغزالی ایک منفرد وممتاز فکشن نگار کے ساتھ ایک منفرد اور صاحب طرز سفرنامہ نگار بھی ہیں۔

سرورغزالی نے اِس مجموعے کا انتساب فہیم اسلام انصاری اور خواجہ محمد اعظم کے نام کیا ہے۔ دیباچہ بعنوان ’’حرفِ اوّل‘‘ میں سرور غزالی نے اعتراف کیا ہے کہ:

> ’’میری یہ کتاب سفرنامہ یا سفری داستان کبھی کتابی صورت میں نہ منظر عام پر آتی اگر فیس بک پر اسے پڑھنے والے، اس کی شد ومد سے تعریف نہ کرتے، اِسے نہ سراہتے ...... کچھ لوگوں کی فرمائش بھی یہی تھی کہ اس سفری داستان کو مجلد، کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ اس کتاب کا پیش لفظ بھی انہی چاہنے والوں کی تحریر کی صورت میں حاضر ہے۔‘‘

زیب اذکار حسین کا شامل مجموعہ مضمون ’’سفری داستان میں تازہ کاری کا ورود‘‘ قاری کو قرأت کے لئے اُکساتا ہے۔ موصوف نے سچ کہا ہے:

> ’’غزالی اہم تفریحی مقامات، شہروں اور شہریوں کا تذکرہ دوستانہ انداز میں یوں کرتے چلے جاتے ہیں کہ کہیں

بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔مختلف شہروں،ملکوں اور متعلقہ مقامات کا تذکرہ اور ان کا تاریخی پس منظر اور وہاں کے رسوم و رواج کے بارے میں وہ یوں بتاتے چلے جاتے ہیں کہ جیسے وہیں کے باشندے ہوں۔ یہ اختصاص سرور غزالی کی سفری داستان کو دیگر سفرناموں سے الگ کردیتا ہے۔''

اِس مجموعے میں بالترتیب ''صحرائے ناتمام''،''ڈنمارک اور سوئیڈن کا سفر''،''زلٹ:ایک جزیرہ''،''وینس کی گلیوں میں''،''براٹیسلوا کی کہانی''،''ہائیڈل برگ کی سیر''،''اوزے ڈوم:مشرقی ساحل (بالٹک سی) کا ایک جزیرہ''،''سفرنامہ بنگلہ دیش''،''شمالی امریکہ کا سفر''، ''سانپوں کی ملکہ کی کہانی''،''جل پریوں کا دیس: بلوٹوتھ کا موجد''، ''لندن کی زمین دوز ٹرینیں: جارج پنجم سے مکالمہ''،''اندلس،غرناطہ اور قرطبہ کی سیر''،''واسکوڈے گاما کے تعاقب میں''،''اہرام مصر''،''دوبئی میں بسنت اور پتنگ،جاب گئی بھاڑ میں''،''ترکی میں انطالیہ''،''چار روز ترکی کے شہر کیسری میں''،''ویانا کی سیر''،''ڈھاکہ کا سفر اور قصہ اٹیچی کا''،''علی وینٹ ٹو لندن.....''، ''لاہور سے کراچی''،''ریل کا سفر اور پیش امام کی نوکری''،''لندن برمنگھم کی سیر اور ادبی سرگرمیاں، لندن اور ایوارڈ''،''اقبال خورشید، سید قیام الدین اور مبشر زیدی''، ''۲۶اپریل سے ۶مئی ۲۰۱۶ء کے درمیان پاکستان میں''،''کراچی کے ادیبوں سے ملاقات''،''لندن میں کنواری سے ملاقات''،''سفرنامہ پیرس'' اور ''ہم نے ڈریسڈن دیکھا'' سفرنامے شامل ہیں۔اِس کے علاوہ دورانِ سفر کی چند یادگار تصاویر قاری کے لئے وقت رخصت عنایت کردہ تحائف ہیں۔

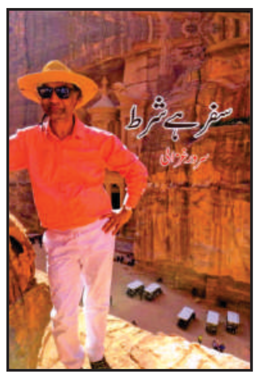

دلکش عنوانات اِن سفرناموں کا ایک اہم اختصاص ہے، جو تاریخی قلعے کے برج کی طرح خوش آمدید کی صدا بلند کرتے ہیں۔

یہ بات جگ ظاہر ہے کہ سرور غزالی ایک منفرد و ممتاز فکشن نگار اور حساس طبیعت شاعر بھی ہیں۔موصوف کا مطالعہ وسیع تر اور مشاہدات عمیق ہیں۔یہ انکشافِ تازہ ہے کہ وہ ایک صاحب طرز سفرنامہ نگار بھی ہیں۔ان کا یہ مجموعہ سفرنامہ، ذخیرہ سفرنامہ میں قابل قدر اضافہ ہے۔ موصوف دورانِ سیر وسیاحت نئی نئی دریافت اور مختلف النوع انکشافات پر پوری توجہ دیتے ہیں، لہٰذا ایسے قاری جو ان مقامات کی سیر و سیاحت کر چکے ہوتے ہیں، وہ بھی اُن کی نظر، دریافت اور انکشاف پر داد و تحسین دینے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔اب آیئے! سرور غزالی کی نظروں سے ڈنمارک اور سوئیڈن کا سفر کریں:

''انسان اس دنیا میں جب سے آیا ہے، یہاں وہاں سفر میں ہے۔زمین جو اپنے محور پر گھوم رہی ہے اور ہم اس میں بیٹھے بھی تو سفر کر رہے ہیں......ڈنمارک ایک جدید ترقی یافتہ ملک ہے اور جرمنی کے شمال میں واقع ہے۔ اس کی جرمنی سے سرحدیں بالٹک سمندر سے ملتی ہیں۔ موجودہ ڈنمارک جو کبھی سلطنت ڈنمارک کہلاتا تھا، اب بس ایک چھوٹا سا ملک ہے۔اس کی کل آبادی چھ ملین سے بھی کم ہے یعنی پورے برلن شہر کی آبادی سے بھی کم۔ اسی طرح کوپن ہیگن کی آبادی فقط آٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ڈنمارک میں ایک مربع کلومیٹر میں اوسطاً ایک سو تیس افراد رہتے ہیں......ایک وادی میں قلعہ ہے جسے 'موزیڈرے قلعے' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تاریخی قلعے، عالمی جنگ اول کی یادگار کو اب ایک میوزیم میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ قلعے کی موجودگی کا بظاہر یوں پتہ نہیں چلتا کہ یہ سمندر کی سطح کے نیچے ایک ڈھلان پر، زمین دوز قلعہ ہے، جس میں جنگی حفاظتی خندقیں ہیں۔ اس میں تین چھوٹی خندق چار بم رکھنے کے شیڈ اور ایک نقل و حمل کی نگرانی کا مرکز کے علاوہ اسلحہ خانہ بھی ہے۔اِس قلعے کی تعمیر سن ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۶ء میں کی گئی تھی ......سن ۱۹۲۲ء تک یہ پوری طرح فعال رہا......ڈنمارک اور کوپن ہیگن کے مابین یہ' اور یسونڈ برج' انجینئرنگ کا

جدید شاہکار ہے۔ اس کا پہلا حصہ زمین دوز سرنگ ہے جو ساحل سمندر کے نیچے سے گزرتی ہے اور پھر باہر نکل کر سمندر کے سینے پر مونگ دلتا ہوا برج کسی کشادہ شاہراہ کی مانند کھلے سمندر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جڑا ہوا ہے۔ اس برج کا نام بھی سویڈش اور ڈینش زبانوں کو ملا کر چنا گیا ہے۔ اسے ترچھے فولادی رسی کا برج کہا جاتا ہے۔ اس کی پہلی منزل جو بسوں اور کاروں کے لئے مخصوص ہے جب کہ نچلی منزل پر ریل کی بچھی پٹریاں ریل گاڑی کے لئے مختص ہے۔ یہ دنیا کا طویل ترین دوہرا، سڑک اور ریل کی پٹریوں والا دو منزلہ پل ہے ...... ایک ہزار ملین یورو سے بنے پل پر سے آہنی کار کے ذریعہ ایک دفعہ گزرنے کے لئے، ٹول ٹیکس ترپن یورو ہے۔ اس پر سے گزرتی شاہراہ ای ۲۰ کہلاتی ہے۔ اس دو منزلہ پل کی کل لمبائی ۷۸۴۵ میٹر اور چوڑائی ۲۳ اعشاریہ ۵ میٹر ہے۔ اس کو سنبھالنے والے ستونوں کی اونچائی دو سو چھ میٹر ہے۔ اِن ستونوں کے نچلے حصے کی پیائش ۱۹ اعشاریہ چار ضرب ۱۱۲ اعشاریہ ۶ میٹر ہے۔ اس پر سے روزانہ ستر ہزار گاڑیاں اور دو سو ریل گاڑیاں گزرتی ہیں۔'' (سفر ہے شرط، ص ۲۶ تا ص ۳۵)

میں اِس سفرنامے کے قارئین کے تجسّس کو زائل کرنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا یہاں صرف ایک سفرنامے کے جگہ جگہ سے لئے گئے کئی اقتباسات کو اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کر دیا ہے۔

اسی سفرنامے میں فکشن نگار سرور غزالی نے اپنی بہترین جزئیات نگاری، منظر کشی اور دلکش پیرایۂ بیان کا خوب خوب مظاہرہ کیا ہے۔ اِن سفرناموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں یکسانیت نہیں ہے۔ جب وہ بنگلہ دیش، پاکستان اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہیں تو انداز و بیان اور موضوعِ گفتگو مختلف ہو جاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کا سرورق دلکش، کاغذ عمدہ، طباعت دیدہ زیب اور قیمت بھی مناسب ہے۔ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ یہ کتاب پروف کی غلطیوں سے پاک ہے۔ اُمید ہے کہ اس مجموعے کی اتنی پذیرائی ہوگی کہ سرور غزالی صاحب کو اس کا دوسرا ایڈیشن (مجلد) منظر عام پر لانا ہوگا۔

نام کتاب	:	الفاظ کا جزیرہ
مصنف	:	تسلیم انجم
ناشر	:	ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۴ء صفحات : ۱۶۰
قیمت	:	۲۰۰ روپے
مبصر	:	**شکیلؔ سہسرامی**

اس وقت میرے پیش نگاہ دیدہ زیب گلابی رنگ کی ایک کتاب ہے، جس کا نام ہے۔ ''الفاظ کا جزیرہ'' یہ ایک شعری مجموعہ ہے جس کے شاعر ہیں جناب تسلیم انجم۔ یہ کتاب اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ حکومت بہار کے اشاعتی امدادی منصوبہ کے تحت شائع ہوئی ہے۔ شاعر نے اس کتاب کا ''انتساب'' اپنے والدین کے نام کیا ہے۔ اس مجموعہ میں صفحہ نمبر ۱۳ سے صفحہ نمبر ۱۸ تک شاعر اور کتاب کے بارے میں مراق مرزا کی ایک تحریر ملتی ہے جس میں اگرچہ پروف کی خامیاں کافی ہیں اور یہ بہت متاثر بھی نہیں کرتی ہے، مگر جو کچھ موصوف نے لکھا ہے وہ حق بجانب لکھا ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ معمر شاعر جناب تسلیم انجم کا پہلا شعری مجموعہ ہے اور اس میں انہوں نے اپنا جو پہلا شعر درج کیا ہے وہ کتاب کے نام کی ترجمانی یوں کرتا ہے ۔

الفاظ کے جزیرے میں بھٹکا ہوا ہوں میں
قسمت میں میری بس ہیں کتابوں کے سلسلے

درج بالا شعر میں لفظ ''بس'' کتابوں سے بیزاری کا اشارہ ہے کہ شاعر مجبوراً الفاظ کے جزیرے میں بھٹک رہا ہے، لیکن اسی بھٹکنے کا نتیجہ ہے کہ تسلیم انجم صاحب کا یہ شعری مجموعہ منظر عام پر آ گیا۔ انجم صاحب کی بیشتر شاعری زندگی کی حرماں نصیبی کا شکوہ معلوم ہوتی ہے مثلاً ۔

ویرانیوں کے شہر میں خالی مکان ہوں
اپنی شکستگی کا میں خود ترجمان ہوں

ہر ایک سمت یہ منظر دکھائی دیتا ہے
کھنڈر سا اپنا بھی اب گھر دکھائی دیتا ہے

زندگی جس کو سمجھتا رہا میں صدیوں سے
انجم خستہ وہی ریت کا صحرا نکلا

ظاہر ہے کہ تسلیم انجم صاحب کے درج بالا تمام اشعار رجائیت سے عاری ہیں اور بہر حال شاعر کا یہ رویہ اظہار مستحسن نہیں لگتا، البتہ کچھ اشعار ایسے ضرور ہیں جو متوجہ کر لیتے ہیں مثلاً ؎

میری طرف بھی گوش بر آواز ہو کوئی
میں بھی تو اپنے عہد کی اک داستان ہوں

پتھر کے شہر سے تو سلامت ہم آئے تھے
شیشہ گروں کے ہاتھ سے مسمار ہم ہوئے

نکلو نہ تیز دھوپ میں باہر مکان سے
شعلے برس رہے ہیں ابھی آسمان سے

کیا مٹ گیا ہے دہر سے اب دوستی کا نام
اب لوگ پیش آتے ہیں اغیار کی طرح

اب یہ عالم ہے کہ نظروں میں کوئی جچتا نہیں
حشر برپا کر دیا ہے اک تری تصویر نے

درج بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر تجربہ کار، دیدہ ور، دور بیں، دور رس اور جہاں دیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی اور زمانے کے متعدد کوائف کا احاطہ اور ذکر اپنی شاعری میں جا بجا کرتا نظر آتا ہے، مگر افسوس کہ

فکر سخن کی روانی نے اس مجموعہ میں لعل و گہر کے ساتھ کچھ خس و خاشاک بھی یکجا کر دیے ہیں جنہیں دوران مطالعہ صفحہ ۱۳۲ سے ص ۱۵۰ تک اور پھر صفحہ ۱۵۲ سے ص ۱۵۸ تک دیکھا جا سکتا ہے۔ کئی کئی غزلیں یہاں مطبوع خاطر ہونے کی صلاحیت پانے کے انتظار میں ہیں اور بہت سارے مکمل یا نامکمل نثری جملے، شعری مصرعے میں ڈھلنے کے منتظر! مزید یہ کہ یہاں بہت سارا مصرع ایسا بھی ہے جس میں کوئی نہ کوئی لفظ کمپوز ہونے سے رہ گیا ہے یا پھر تذکیر و تانیث کی غلطی در آئی ہے مثلاً ع

زخم کے قندیل کیوں کر جل اٹھی (ص۵۲)
دور تھا نظروں سے ساحل پاس تھی اپنی بھنور (ص۵۳)

لیکن مذکورہ مثالوں سے یہ نتیجہ نکالنا یقیناً زیادتی ہوگی کہ جناب تسلیم انجم کی شاعری سہو صرفیات کا پشتارہ ہے یا ان کا مجموعہ معیار کے لحاظ سے قحط اشعار کا شکار ہو گیا ہے ؎

عمر بھر ان کی تمنا ہم لئے پھرتے رہے
سایہ دیوار تھے وہ، ہاتھ آتے کس طرح
دعوت نظارہ وہ خود جب ہمیں دیتے رہے
پھر بھلا انجم نگاہیں ہم چراتے کس طرح

چپکے سے جب وہ آ گئے صحن خیال میں
ویرانۂ حیات میرا مسکرا دیا

محولہ بالا تینوں اشعار رنگ تغزلانہ کی دلکش تصاویر ہیں۔ ''سایہ دیوار''، ''دعوت نظارہ''، ''صحن خیال'' یقیناً ایسے خوبصورت شعری مرکبات ہیں جو شاعر کی ہنرمندی کو ظاہر کرتے ہیں کہ نادر مرکبات سے شعر بھی نادر ہو جایا کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں ''الفاظ کے جزیرے'' سے ملنے والے یہ مروارید سخن بھی دیکھیں ؎

ذہن و دل کے قریب اے انجم
چھا گیا ہے عجیب سناٹا

حیات وموت کیا ہے سوچتا ہوں
میں ننگے پیڑ کے نیچے کھڑا ہوں

گزرتی ہے کیا کیا محبت میں دل پر
لہو رو رہا ہوں تمہیں کیا پتا ہے

اس مجموعہ کی ایک عجیب وغریب بات یہ ہے کہ مصرع نمبر ۱۹ سے مصرع نمبر ۱۵۹ تک کے ہر مصرع کے داہنی طرف ایک ڈیش کا (-) نشان ہے

جو بے معنی اور بے ربط ہے اور اس سے کتاب کے حسن میں کوئی اضافہ بھی ہوتا نظر نہیں آتا۔ شاعر نے ایسا کیوں کیا، معلوم نہیں۔

بہر کیف میں اپنے اس تبصرے کا اختتام ''الفاظ کا جزیرہ'' کے شاعر تسلیم انجم صاحب کی غزل کے ایک عمدہ شعر پر کرنا چاہتا ہوں ۔

شناور ہو تو پہنچو اس کی تہہ تک
بہت گہرا ہے یہ دریا غزل کا

بیشک شناوری شرط ہے جو شاعر کے حوصلے اور صلاحیت سے بعید نہیں اور یہی اس کے کامیاب حال و مستقبل کی یقینی ضمانت بھی ہے۔ یہ امید غلط نہیں کہ جناب انجم کے الفاظ کے جزیرے کا منظر نامہ آج بھی پزیرائی سے محروم نہیں رہے گا اور کل جب یہ افکار و اشعار کا جزیرہ بن کر آئے گا تو صرف آج کی شکایتوں کے دفتر ہی نہیں ڈھل جائیں گے بلکہ ان کی جگہ توصیف و تحسین کے دفتر بھی جدول بہ جدول کھلتے چلے جائیں گے۔

نام کتاب	:	سپنوں کا شیش محل			
مصنف	:	ڈاکٹر محمد ارمغان ساحل سہسرامی			
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی			
صفحات	:	۱۱۶	قیمت	:	۱۵۰ روپے
مبصر	:	اشفاق عادل			

''سپنوں کا شیش محل'' ڈاکٹر محمد ارمغان ساحل سہسرامی کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جس میں پندرہ افسانے شامل ہیں۔ یہاں افسانہ نگار کے سوانحی کوائف، عشرت ظہیر کے مقدمے اور مصنف کی ''اپنی بات'' سے گزر کر جب مشمولہ افسانوں کی دنیا میں ہم پہنچتے ہیں تو یقیناً ہمیں مایوسی ہی مایوسی ہاتھ نہیں آتی ہے۔

زیر نظر کتاب کے پس ورق پر معروف شاعر شاہد جمیل صاحب کے کلمات ہیں جن کے مطالعہ ہم ارمغان ساحل کی افسانہ نگاری کے ذوق و شوق، ان کی سوانح اور افسانوں کے محاسن سے روشناس ہوتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے اپنا ادبی سفر شروع کیا اور یہ افسانوی مجموعہ اتنی تاخیر سے کیوں اشاعت پذیر ہوا۔

ارمغان ساحل ''کچھ اپنی بات'' میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے ۱۶۶۸ء سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ ابتدا بیشتر لوگوں کی طرح بچوں کے لئے نظم نگاری اور کہانی سے کی۔ ذوق اور پروان چڑھا تو بڑوں کے لئے بھی شاعری اور افسانہ نگاری کی راہ پر گامزن ہوئے۔ کچھ عرصہ اس کوچے کی آوارہ گردی کرنے کے بعد یہ ذوقِ ادب ستم ہائے روزگار کی نذر ہو گیا۔ ملازمت سے وظیفہ یاب ہوئے تو انہیں اپنے ادب پاروں کی یاد آئی اور صندوقچے سے ان کو نکالا اور جھاڑ پونچھ کر زیور طباعت سے آراستہ کر کے اب اپنا یہ ''سپنوں کا شیش محل'' سامنے لایا ہے۔

زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ میں سبھی افسانے واضح بیانیہ انداز کے ہیں اور کہانی پن کے جوہر سے مزین ہیں۔ تقریباً تمام افسانوں کے قصے میں رومانیت، انسانی جذبات کے اُتار چڑھاؤ اور عورت کی نفسیات کو مرکزیت حاصل ہے۔ یہ افسانے اس زمانے میں تخلیق کئے گئے تھے

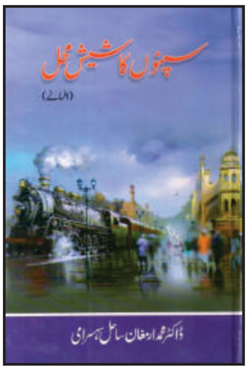

جب جدیدیت عہد شباب پر تھی۔ ایک طرف ''شب خون'' جیسا رسالہ تھا تو دوسری طرف ''بیسویں صدی'' جیسا پاپولر رسالہ تھا، جس میں جدیدیت کی راہ پکڑنے والے بھی کبھی چھپنا فخر سمجھتے تھے، لیکن جلد ہی بیشتر قلم کاروں نے ہوا کا رُخ پہچانا اور اپنا راستہ بدل لیا، البتہ ارمغان ساحل ''بیسویں صدی'' کی شاہراہ پر چلتے رہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اب بیانیہ کا دور لوٹ آیا ہے، جہاں قصہ، کردار، واقعات وغیرہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور اس عہد میں ان کے مجموعے کا منظر عام پر آنا ''دیر آید درست آید'' کے مصداق ہے۔

''سپنوں کا شیش محل'' کے افسانوں کے بیشتر کردار رومانی فضا میں سانس لیتے ہیں اور زندگی کی کشمکش سے نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ''سراب''، ''ریشمی رومال''، ''پشیمانی''، ''پچھلا دروازہ''، ''جنونِ عشق'' وغیرہ قابل ذکر ہیں، جن میں جواں دلوں کے جذبات، کشمکش اور عورت کی بے وفائی کے قصے کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے دیگر افسانوں کی بنت بھی کم و بیش یہی ہے۔

(بقیہ ص ۷۲ پر)

☆ ''زبان وادب'' اگست ۲۰۲۴ء موصول ہوا۔ سرورق سے لے کر پس ورق تک اس کی خوشنمائی اور جاذبیت انتہائی قابل تعریف ہے۔ آزادی کے مہینے کی مناسبت سے سرورق پر ہندوستان کے نقشہ اور ترنگے پرچم کے ساتھ آپ نے خطاطی کے مختلف نمونوں میں لکھے گئے، اقبالؔ کے مصرع ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کو جس اہتمام سے سجایا ہے، اس کے لئے خصوصی مبارکباد! یہ بس آپ کا صحافتی ذوق اور آپ کی صحافتی بلند نظری ہے، جس کے طفیل اکادمی مجلّہ کا صوری اور معنوی حسن ومعیار آئے دن بڑھتا جارہا ہے۔ دونوں اندرونی سرورق کے تعلق سے بھی یہ پیش رفت بیک نظر سامنے آگئی کہ صباؔ عظیم آبادی اور قمرؔ زاہدی کو صرف ان کی تصویر اور ان کے کلام کے ساتھ ہی جگہ نہیں ملی ہے، بلکہ مختصر سوانحی احوال وکوائف اور ان کی کتابوں کے عکس اور پھر عکس تحریر بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ زیرنظر شمارے میں ''حرف آغاز'' سابقہ روایت کے مطابق بہت ہی جامع ہے اور مشمولات سے متعارف کرادینے میں نہایت کامیاب، پھر ''ذکر وطن'' کے تحت شامل مضامین اور نظموں کا کیا کہنا، ان اوراق نے تو نہایت خاموشی اور خوبصورتی سے اس شمارے کو بہترین اور حسین ترین دستاویز بنادیا ہے۔ ڈاکٹر نشاط اختر نے ''ذکر وطن اور اردو شاعری'' پر لکھتے ہوئے، بڑی علمیت کے ساتھ موضوع کا حق ادا کیا ہے، خصوصاً وطنی شاعری کیا ہے اور اس کی گوناگوں اہمت وافادیت اور عظمت کس طرح سامنے آتی ہے اور زمانے کی ضرورت بنتی چلی جاتی ہے، ان باتوں کو انہوں نے بہت ژرف نگاہی سے قلمبند کردیا ہے۔ جناب نجم الزماں نے ''علامہ جمیلؔ مظہری کی دو وطنی نظمیں: ایک تجزیہ'' بھی بہت محنت و دیانت سے اور دل لگا کر لکھا ہے جس سے علامہ کی نظم ''بھارت ماتا'' اور ''اے مادر ہندوستان'' کے بیشتر فکری وفنی پہلو روشنی میں آجاتے ہیں۔ ''عصمت چغتائی کی خاکہ نگاری'' اس شمارے کے مقالاتی حصہ کی جان ہے، پروفیسر ڈاکٹر توقیر عالم نے نہ صرف ایک ایسے موضوع کو اٹھایا ہے جس پر شاید بقدر بادام بھی نہیں لکھا گیا ہے، بلکہ متعلقہ موضوع کے تمام پہلو بھی اختصار اور جامعیت کے ساتھ سپرد قلم کردیا ہے۔ اس حصہ میں ''ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی بیدلؔ شناسی'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید نقی عباس کیفی کا مقالہ بھی نہایت پُرمغز اور معلوماتی ہے۔ اسے پڑھ کر خیال آیا کہ کبھی بیدلؔ کی ریختہ گوئی پر بھی کچھ تحقیقی مواد تفصیل سے پڑھنے کو مل جائے تو کیا خوب ہو۔ یہاں ''ڈاکٹر نوشہ اسرار کی شاعری کی بازگشت'' بھی ڈاکٹر سید احمد قادری کی کاوش سے دیر تک سنائی دیتی رہی اور محظوظ کرتی رہی۔ حالیؔ پر ساحرؔ داؤدنگری کے مضمون کا وہ حصہ خاص طور سے جالب مطالعہ ہے جس میں انہوں نے مرقد حالیؔ پر حاضری اور وہاں کے مناظر کی تفصیل بتائی ہے۔ ''یادیں'' کے تحت اس شمارے میں راشد انور راشد پر ڈاکٹر ابرار رحمانی کی، بدنامؔ نظر پر ڈاکٹر احمد صغیر کی اور ظفرؔ رانی پوری پر ڈاکٹر صابر علی سیوانی کی تحریریں پڑھنے کو ملیں جو صرف تاثراتی نہیں کہلاسکتیں بلکہ خاصی معلوماتی بھی ہیں۔ ''افسانے'' بھی اپنے اپنے رنگ میں اچھے ہیں، البتہ ''طنز ومزاح'' کے تحت طبیب احسن تابش کی تحریر ''لیٹ'' نے امیدوں سے سوا حظ وانبساط بخشا۔ زیرنظر شمارے میں ''منظومات'' اور ''کتابوں کی دنیا'' سے تعلق رکھنے والی کاوشیں بھی قلم کاروں کے خلوص اور محنتوں کی آئینہ داری کررہی ہیں۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی بہت کامیاب ہے اور ثنا ثمرین نے تو ''آزادی'' پر پورا فوق نقاط مضمون لکھ کر حیرت میں ڈال دیا ہے۔ خدا کرے انہیں اسی طرح نئے نئے انداز سے اردو کی خدمت کے حوصلے ملتے رہیں۔ اردو میں سائنسی کہانیوں کی عام طور سے کمی رہتی ہے، اس تناظر میں جہانگیر انس نے بچوں کو ''قوس قزح کی کہانی'' سنا کر بڑا اچھا کام کیا ہے۔ دعا گو ہوں کہ اکادمی مجلّہ اسی طرح اردو قارئین کو علمی اور ادبی فیض پہنچاتا رہے۔ آمین!

ایم۔ احمد توصیف، مظفر پور

☆ ''زبان وادب''اگست ۲۰۲۴ءموصول ہوا۔ٹائٹل رنگین اورخوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ موقع کی مناسب سے بہت بامعنی بھی ہے۔ اسے دیکھ کرخطاطی کے بھولے بسرےفن کی یادبھی تازہ ہوگئی۔کبھی اسی حیثیت سےروزناموں میں ملازمت کتنے ہی افرادکاذریعہ معاش تھی۔بہرحال''ذکروطن''کےمتنی اوراق کی اس ٹائٹل پیج سے خاصی نمائندگی ہورہی ہے۔اس تعلق سےڈاکٹرنشاط اختراورجناب نجم الزماں کے مضامین اپنی اپنی جگہ نہایت علمی مرتبہ رکھتے ہیں۔اس حصہ کا شعری متن بھی بہت شگفتہ ہے۔''مقالات''میں پروفیسرتوقیرعالم اور ڈاکٹرسیدنقی عباس نقوی کےمضامین بلاشبہ موضوع کےلحاظ سےتقریباً اچھوتے اورمواد کےلحاظ سےبیش ازبیش بھرپورہیں۔عصمتؔ کے خاکوں پربہت کم لکھا گیاہےاور بیدلؔ کی شاعری پرایک مستندایرانی محقق کاتجزیہ بھی اردومیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا،اس لئے ان دونوں مضامین نے فطری طورپرزیادہ خوش کام بنایا۔''یادیں'' کا حصہ بھی یقینی طورپرمعلومات سے خالی نہیں۔راشد احمد راشدؔ،بدناؔم نظراورظفؔررانی پوری ــــــ آہ!دست اجل نے کیسی کیسی ہستیاں چھین لیں۔افسانہ''بوجھ''(محمدطارق)کےبارے میں دوران تجزیہ، آپ نے سوبات کی ایک بات لکھ ہی دی ہے کہ مردوزن کےاختلاط کی کھلی چھوٹ بہرحال بوجھ ہلکانہیں کرتی بلکہ سداکئے لئے بوجھ ڈال جاتی ہے۔یوں بھی یہ کہانی کچھ زیادہ نہیں جچی اورایسالگا کہ ایک باپ پرکچھ مضحکہ خیزاورمصنوعی قسم کا کردارتھوپ دیا گیاہے۔رہی بات افسانہ''رنگ''(احمدریاض)کی تویقیناًاستحصال پسند معاشرے میں،حسب حالات مردوعورت دونوں ہی اپنے مقصد کےیاربن ہی جاتے ہیں۔اس کہانی میں استحصال کی نسبت عورت کی طرف ہےاور موضوع کی قدرے فرسودگی کے باوجوداسی پہلو نے اسے جالب مطالعہ بنادیا۔کوئیلری مزدوروں پرلکھی گئی کہانیوں میں''ماں کاشکم'' (امتیازغدر)اس لئے بھی پسندآئی کہ یہ ایک مقولےکوواقعاتی سطح پر لانے میں کامیاب ہے۔طبیب احسن تابش کی طنزیہ ومزاحیہ تحریر ''لیٹ''،بھی خوب ہے خاص طورسے اس کےآخری حصہ میں آنے والےشعرنے تومصرع بہ مصرع ڈرامائی رنگ سےمحظوظ کرنے میں کوئی کسرنہیں رکھی ہے۔وارث ریاضی،ظفراقبال ظفؔراورخالدعبادی کی غزلیں خاص طورسے پسندآئیں۔کتابوں پرتبصرے بھی نہایت جامع اورمتوازن ہیں۔بچوں کے لئے اس بارجوچیزیں شامل ہوئی ہیں وہ بھی ان کی نفسیات اوردلچسپی سےہم آہنگ ہی کہلائیں گی۔

محمدزبیراحمد،بیگوسرائے

☆ اگست ۲۰۲۴ءکا''زبان وادب'' ملا۔ ماہِ آزادی کی مناسبت سے، بڑوں ہی کے لئےنہیں بلکہ بچوں کے لئےبھی اس بارکاشمارہ آپ نے خوب سجایا ہے۔صبؔا نقوی کی نظم''معصوم دل کی دعا'' کے ساتھ شروع ہونے والا یہ''بچوں کازبان وادب''بہت ہی پسندآیا۔سچ مچ شاعرنے کتنے اچھےطرزوانداز سے یہ دعائیہ نظم لکھی ہے کہ باربار پڑھتے رہنے کوجی چاہتا ہے۔یہاں ہرشعرمیں ایک ہی مصرع کی تکرار ہےجس سے بڑی ہی پاکیزہ فضابن جاتی ہے ؎

معصوم دل کی ہے دعا یا رب بحق مصطفیٰ

حسن عطا کے نام پر لوح وقلم کی بھیک دے

اسی صفحہ پر،''ناک اس کی کٹ گئی'' کےعنوان سےظفرعلی خاں کی نظم بھی پڑھی۔صرف چارشعر ہیں،مگرشاعرنے حدیث پاک کے واقعہ کوایسے انداز سےلکھ دیاہے کہ وہ دل کوچھولیتاہے۔سچ مچ والدین کی نافرمانی سے بڑھ کراورکون سی بدبختی ہوسکتی ہے۔جناب جہانگیراُنس نے''قوس قزح کی کہانی'' سناکربڑے کام کی سائنسی معلومات دی ہے۔اس شمارے میں محترمہ ثناثمرین کامضمون''آزادی'' آپ نے چھاپا ہے،اس مضمون کے لئے انہیں بہت بہت مبارکباد! اس میں انہوں نےصرف حرف کےاوپرنقطہ والےلفظ سے ہی کام لیاہے۔سچ مچ اس میں ان کوکتنی محنت لگی ہوگی اورکتنادماغ خرچ کرنا پڑاہوگا،مگرہےاپنے رنگ کابالکل اچھوتامضمون!ایک بارپھران کو دلی مبارکباد!جناب ابراہیم ہوشؔ کی نظم''......اے پرچم لہرائے جا'' بھی بہت پیاری نظم ہےاورآپ نے اس کوچھاپا بھی توہے،ترنگے کے پورے اہتمام کے ساتھ،واقعی وہ اس اہتمام کی حقدار ہے۔ جناب محمدرضوان احمد سےاس شمارے میں''دوحکمراں،دوکہانی'' کے ساتھ ملاقات ہورہی ہے۔بیشک عقل اللہ کی نعمت ہےاورہرحال میں

نیک نیتی کے ساتھ ہی اس سے کام لینا چاہئے۔ یہاں جناب نصیر احمد عادلؔ کی نظم ''پیڑ لگائیں'' اور جناب التفات رضا کی نظم ''حج مبارک'' بھی خوب ہے۔ خدا کرے ''بچوں کا زبان وادب'' اسی طرح سدا اپنی روشنی بکھیرتا رہے۔ آمین!

نوازش خرم، نئی دہلی

☆ سہیل عظیم آبادی کی تصویر سے آراستہ سرورق اور رشید جہاں کی تصویر سے آراستہ پس ورق کے ساتھ جولائی ۲۰۲۴ء کا ''زبان وادب'' ملا، جس کے پہلے اندرونی سرورق پر موجؔ عظیم آبادی کی تصویر اور غزل کے ساتھ ان کی مختصر سوانح عمری دی گئی ہے اور آخری اندرونی سرورق پر بیتابؔ عظیم آبادی کو ان کی تصویر، غزل اور سوانح کے ساتھ جگہ ملی ہے۔ شمارے کا ''حرف آغاز'' ایک جامع تعارف نامہ ہے جو نہایت خوبصورت زبان میں اپنا مقصد پورا کر رہا ہے۔ ''مقالات'' کے زمرے میں اگرچہ آٹھ تحریریں شامل ہیں، مگر وقت کی کمی نے ابھی صرف تین ہی مقالے پڑھنے کا موقع دیا ہے۔ ایک تو ڈاکٹر سید صابر حسن کا مقالہ بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری پر ہے، جسے کئی خوبصورت عکس کے ساتھ آپ نے سجایا بھی ہے اور جناب صابر حسن نے ظفرؔ کے اشعار کا حوالہ لیتے ہوئے ان کا سخنورانہ مرتبہ متعین کرنے کی بھی مستحسن سعی کی ہے۔ دوسرا مقالہ جسے شروع کرنے کے بعد، عدیم الفرصتی کے باوجود میں ادھورا نہیں چھوڑ سکی، وہ ہے ڈاکٹر آسیہ پروین کا مقالہ جس میں انہوں نے سہیل عظیم آبادی کی مختصر سوانح کے ساتھ ان کی کہانی ''بھابھی جان'' کا تجزیہ پیش کیا ہے جو واقعی بہت زبردست اور کامیاب تجزیہ ہے۔ اسے پڑھ کر یہ سمجھنے کا موقع بھی ملا کہ کسی افسانے کا فنی اور فکری تجزیہ کتنی باریک بینی اور کتنی محنت چاہتا ہے۔ اس وقیع مقالے کے بعد تیسرا مقالہ، جو بہت سی نئی معلومات دے گیا، وہ ہے قمر فاطمہ صاحبہ کا مقالہ جس میں انہوں نے ''انگارے والی'' رشید جہاں کی زندگی اور ان کے ادبی کاموں پر بھرپور نظر ڈالی ہے۔ یہ دونوں مقالے بھی آپ نے متعلقہ عکوس کی شمولیت سے گویا ''دو آتشہ'' بنا دیا ہے۔ ''افسانے'' کے زمرے میں ڈاکٹر نریش کی کہانی ''احتمال''، ہو یا شریں نیازی کی کہانی ''ابھیان'' اور افتخار عظیم چاند کی کہانی ''محسن''، یہ سبھی کہانیاں اپنے اپنے انداز میں متاثر کر گئیں۔ ''احتمال'' میں اگرچہ آخری سطروں کا انکشاف ''میں اور میرا پیارا بھیا'' کہانی کو واقعاتی مبالغہ کی طرف لے جاتا ہے، مگر عورت کی عظمت اور اس کا جذبہ دکھانے میں، جو دنیا کی ایک بڑی سچائی ہے، کچھ بھی کمی نہیں آنے دیتا۔ اسی طرح ''ابھیان'' پر ایک قسم کا صحافتی رنگ بھی آ گیا ہے، لیکن آپ نے ٹھیک لکھا ہے کہ اس میں ''آج کے سلگتے ہوئے سماجی موضوع پر ایک سفاک حقیقت کا واشگاف تجزیاتی اظہار (جس طرح) پیامی اشارے کے ساتھ ہوا ہے۔'' وہ نظر انداز نہیں ہو سکتا۔ ''احتمال'' ہو یا ''ابھیان'' دونوں عورت کے ساتھ دھوکے ہی کی کہانی ہے اور رہی بات ''محسن'' کی تو بس یہی آرزو کر سکتی ہوں کہ سماج کو علی محسن سا کردار سدا ملتا رہے۔ ''منظومات'' کے ذیل میں ذاکرہ شبنم صاحبہ کی غیر منقوط حمدیہ اور نعتیہ کاوش کا کیا کہنا۔ اس حصہ کی مزید تقدیسی شاعری ہو، یا نظمیں اور غزلیں اپنی اپنی جگہ نہایت کامیاب ہیں۔ ''کتابوں کی دنیا'' کے تبصرے بھی لائق مطالعہ ہیں اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی ''موبائل کی لت'' (اظہر نیر) ''قومی پرچم کا سفر'' (عائشہ رفعت) اور ''تیل اور چربی'' (محمد غفران) کی شمولیت سے باوزن اور بامعنی بن رہا ہے۔ زیادہ رسالہ کی ترقی کے لئے دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ

(ڈاکٹر) ایس جبیں، سمستی پور

☆ جولائی ۲۰۲۴ء کا ''زبان وادب'' پیش نگاہ ہے۔ اس شمارے کا مقالاتی حصہ کافی معلوماتی ہے۔ یہاں بہادر شاہ ظفر اور مولانا ابوالکلام آزاد پر جو مضامین شامل ہوئے ہیں وہ خاص طور سے پسند آئے۔ مولانا آزاد کی شاعری پر لکھے گئے مقالہ میں شہر سہسرام اور سہسرام کے کہنہ مشق شاعر مولانا آزاد کے استاد سخن مولوی عبدالواحد خان سہسرامی کا ذکر پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سکندر احمد کے تعلق سے جو ملفوظات رقم کئے گئے ہیں، میں ان سے اتفاق کرتا ہوں۔ حسن عسکری صاحب کے بارے میں جتنا لکھا گیا ہے وہ ناکافی ہے، یہ مضمون کچھ اور وسعت چاہتا تھا۔ پروفیسر وہاب اشرفی صاحب کو اردو ادب کی شان کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ سہیل عظیم آبادی کے افسانہ ''بھابھی جان'' سے

زیادہ ان کے سوانحی احوال وکوائف اچھے لگے۔افسانہ ''احتمال'' ایک بار نہیں دوبار پڑھنے کا متقاضی ہے۔''ابھیان'' جیسا افسانہ لکھنے کے لئے شیر کا جگر چاہئے۔ میں افسانہ نگار کو بار بار مبارکباد پیش کرتا ہوں۔''محسن'' جیسا افسانہ شاذونادر ہی پڑھنے کو ملتا ہے۔افسانے کی بنت بہت اچھی لگی۔''بچوں کا زبان وادب'' میں اظہر نیر صاحب کی کہانی دل کو چھوگئی۔

شکیلؔ سہسرامی، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' جولائی ۲۰۲۴ء ملا۔حسب روایت اس شمارے میں بھی بچوں کا حصہ بہت اچھا ہے۔آج کے سماج میں ''موبائل کی لت'' بالکل عام ہوچکی ہے، بلکہ نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ کوئی شخص اگر اس سے ذرا دور رہے تو لوگ اُسے بیوقوف سمجھنے لگے ہیں اور حیرت سے دیکھتے ہیں۔موبائل فون کی یہ لت بڑوں سے بچوں میں آئی ہے، مگر اس کے نقصانات کیا کیا ہیں، اسے سمجھنے کے لئے بہت کم ہی لوگ تیار ہوتے ہیں۔ بہرحال جناب اظہر نیر نے اپنی کہانی میں انور کی بیماری کا حال لکھ کر ہمیں متنبہ کیا ہے کہ ہم موبائل سے کام بھر کام رکھیں، ورنہ دماغی طور پر ہمیں بھی پریشانی کا سامنا ہوسکتا ہے۔ جناب محمود اختر جلال پوری نے ''بلب'' کے موجد ایڈیسن کے بارے میں بھی ''یہ روشنی کہاں سے آئی؟'' کا عنوان دے کر معلوماتی باتیں بڑے دلچسپ انداز سے لکھی ہیں۔اس شمارے میں جناب صغیر احمد صوفی کی منقبت ''حضرت امام......'' بھی خوب ہے۔محترمہ عائشہ رفعت نے ''قومی پرچم کا سفر'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے، میرے خیال میں وہ اس حصہ کا سب سے اچھا مضمون ہے، اس لئے کہ قومی پرچم کے بارے میں اس طرح ساری معلومات ایک جگہ سمیٹ کر بہت کم ہی لکھی جاتی ہیں۔ یہ مضمون باتصویر ہے اور اس کی وجہ سے اس کے فائدے اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ جناب یٰسین انصاری کی نظم ''ننھے فرشتے'' بھی بہت اچھی لگی۔اس پیاری پیاری سی نظم ہی کے صفحہ پر آپ نے ''ناصحانہ اشعار'' کے عنوان سے جو فیلر ڈالا ہے وہ بھی بہت قیمتی ہے۔''تیل اور چربی'' کا استعمال تو رات دن کھانوں میں ہوتا رہتا ہے، مگر اس عنوان سے جب جناب محمد غفران کا مضمون پڑھا، تب اس کے بارے میں بہت ساری سائنسی معلومات بھی ملی اور تیل اور چربی کا فرق بھی معلوم ہوا کہ کتنے درجہ حرارت پر چربی ٹھوس ہوجاتی ہے۔ یہ مضمون بھی موضوع اور مواد کے لحاظ سے بہت خاص ہے، پھر محترمہ اقصیٰ نوری نے ''برسات کا موسم'' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، وہ بھی پسند آئی۔میری جانب سے سبھی قلم کاروں کو مبارکباد!

محمد کاشف احمد، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' جون ۲۰۲۴ء موصول ہوا۔''اداریہ'' میں مشمولات کا تعارف پیش کیا گیا ہے جس سے قاری کو بڑی اعانت نصیب ہوتی ہے۔ یہاں ''ذکر سیمابؔ'' میں دو مقالے شامل ہیں۔ پہلا بعنوان ''سیماب کا نثری رسالہ: انمول موتی'' محترمہ درخشاں جبیں کا تحریر کردہ ہے۔اس میں سیمابؔ اکبرآبادی کے مذکورہ رسالہ کا ذکر ہے۔ سیمابؔ نہ صرف پرگو شاعر تھے بلکہ عمدہ نثار بھی تھے، چنانچہ مصنفہ نے اپنے مضمون کو ہر دو طرح کے ادبی اقتباسات سے سنوارا ہے۔ ویسے بھی مصنفہ کو زبان و بیان پر بھرپور عبور حاصل ہے۔اسی سلسلہ کے دوسری کڑی جناب ایم احمد توصیف صاحب کی تحریر ''سیمابؔ: عالم آشوب کا شاعر'' ہے۔اس میں پیدائش تا آخر مصنف کے بیان میں جو وضاحت ہے اس کی وجہ سے تحریر میں عمدگی کا احساس ہوتا ہے اور اقتباسات کا مزہ الگ۔''مقالات'' میں چار مقالات درج ہیں۔ پہلا مقالہ ''سرائے کے باہر: ایک تجزیاتی مطالعہ'' ڈاکٹر احمد علی جوہر کا ہے، اس میں کرشن چندر کے افسانے، ناول، خاکے، ڈرامے اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔اگر اس کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس میں تجزیاتی مطالعہ کی بہ نسبت حالات حیات زیادہ ہیں، البتہ اقتباسات میں کہیں کہیں کسی قدر تجزیاتی پہلو نظر آتے ہیں۔ دوسرا مقالہ محترم سیفی سرونجی کا پیش کردہ ہے، بعنوان ''مشرقی تہذیب کا سچا عاشق: اکبرؔ الہ آبادی'' اس مقالہ میں یہ بتانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ اکبرؔ الہ آبادی نے جو دیکھا محسوس کیا، اسے طنز ومزاح کے انداز میں اپنی شاعری کے ذریعے نہایت خوبی و خلوص کے ساتھ پیش کیا ہے۔تیسرا مقالہ ڈاکٹر آفتاب عالم کی نگارش بعنوان ''بدرؔ اورنگ آبادی کی نثری خدمات'' ہے۔یہ اورنگ آباد

صوبہ بہار سے تعلق رکھتا ہے اور بدؔر وہیں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اورنگ آباد کے مشہور شاعر ہونے کے علاوہ نثر نگاری میں بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی کچھ قابل مصنف نے اس مقالہ میں وضاحت سے تحریر کیا ہے۔ چوتھا اور آخری مقالہ ڈاکٹر محمد ثاقب انور نے تحریر کیا ہے اور عنوان رکھا ہے ''بیدی کے ببل پر ایک نظر'' لیکن اس میں ببل کے بجائے بیدی پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ ''یادیں'' کے ذیل میں تین مضامین دیئے گئے ہیں۔ پہلے پہل ''کچھ یادیں کچھ باتیں سلام بن رزاق کی'' صدر عالم گوہر نے پیش کی ہیں، جس میں کتابوں کے متعلق ہی یادیں اور باتیں بیشتر درج ہیں، مگر اچھا مضمون ہے۔ پڑھنے میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ نے ''محمد یونس ہرگانوی: حیات و خدمات'' پر مضمون لکھا ہے، جس میں فارسی آمیز اشعار بڑا لطف دیتے ہیں۔ یادوں میں تیسری یاد وہ ہے جسے ثناء اللہ ثنا دوگھری نے ''ناشاد اورنگ آبادی: یادیں اور باتیں'' کے عنوان سے لکھا ہے اور ان کی یادوں اور باتوں کو پیدائش سے لے کر وفات تک پیش کیا ہے۔ ''افسانے'' کے ذیل میں تین افسانے دیئے گئے ہیں۔ پہلا افسانہ جناب رفیع حیدر انجم کا لکھا ہوا ہے۔ عنوان ہے ''کھنڈروں میں بسے ہوئے لوگ''، لیکن از اول تا آخر اس میں لپ اسٹک کا ذکر ہے۔ اس لحاظ سے اس کا عنوان بھی یہی رکھ دیا جاتا تو کیا ہی بہتر ہوتا۔ دوسرا افسانہ رئیس صدیقی نے لکھا ہے۔ عنوان ہے ''شاہین'' جو اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، لیکن اسے جانوروں سے محبت تھی اور اسی بنیاد پر اسے سرکس میں کام کرنے کا موقع ملا۔ یہاں موضوع میں تنوع اور موزونیت ہے، اس لیے افسانہ نہایت ہی دلچسپ ہو گیا ہے اور واقعی بہت عمدہ افسانہ بن گیا ہے۔ جناب راجہ یوسف نے اپنا افسانہ ''خوشبو'' پیش کیا ہے۔ اس میں پھول تو کئی ہیں لیکن خوشبو کسی میں نہیں۔ ''منظومات'' میں فخر مہدانوی داناپوری کی حمد ''خداوندا'' پیش کی گئی ہے۔ اس کے ہر شعر کی ابتدا ہی ''خداوندا......'' سے ہوتی ہے۔ اچھی نظم ہے، پڑھنے میں وجد کا ایک عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد غزلیں ہیں اور سبھی اچھی ہیں، بالخصوص ڈاکٹر مقصود عالم رفعت کی غزل نہایت دل نشیں اور عمدہ ہے۔ بس ذرا قافیہ میں ''معجزہ'' کے بجائے کوئی دوسرا مناسب لفظ رکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' میں دو دِل خوش نظمیں اور چار اچھے اچھے مضامین شامل ہیں۔ اس طرح یہ شمارہ نہایت پر بہار ہے۔

مصطفٰی ندیم خان غوری، اورنگ آباد، مہاراشٹرا

☆ جون ۲۰۲۴ء کا ''زبان و ادب'' موصول ہوا۔ رسالہ کا سرورق ''ذکر سیمابؔ'' کی موضوعی رعایت سے بہت خوبصورت ہی نہیں، یک گونہ دستاویزی بھی ہے۔ محترمہ درخشاں جبیں نے سیمابؔ کے نثری رسالہ ''انمول موتی'' کو اٹھایا ہے تو اس کے تجزیے میں کسی پہلو سے گویا کوئی کمی نہیں آنے دی ہے، پھر جناب ایم احمد توصیف بھی سیمابؔ کی رباعیوں کے مجموعہ ''عالم آشوب'' پر ادبی گفتگو میں کامیاب نظر آرہے ہیں۔ جہاں تک ''مقالات'' کا معاملہ ہے ڈاکٹر احمد علی جوہرؔ کی تحریر، کرشن چندر کے ڈرامے ''سرائے کے باہر'' کا نہایت سلجھا ہوا تجزیاتی مطالعہ سامنے لانے میں یقینی طور سے کامیاب ہے۔ اس شمارے میں ''یادیں'' کے تحت مختلف شخصیتوں پر جو مضامین دئے گئے ہیں وہ بھی معلومات سے خالی نہیں اور ''افسانے'' بھی یقیناً اچھے اچھے ہیں۔ خاص طور سے رئیس صدیقی کی کہانی ''شاہین'' میں اس کی ہیروئن نے اپنی ماں کو جو جواب دیا ہے، وہ تو بار بار سوچنے پر مجبور کر رہا ہے، لیکن ہزار بار سوچنے سے بھی حقیقت تھوڑی ہی بدلتی ہے، سرکس میں، کچھ گھنٹے موت کے سائے میں گزار لینا، واقعی آج ہر طرف پھیلی ہوئی انسانی منافقت اور گمراہ کن رو پہلے سائے کے مقابلہ میں زیادہ خطرناک نہیں۔ جہاں تک ''منظومات'' کا معاملہ ہے، فخر مہدانوی داناپوری کا مناجاتی کلام سچ مچ اپنے طرز و آہنگ سے ایک سماں باندھ دینے والا کلام ہے اور اس کے بعد اس شمارے کی غزلوں کے بارے میں باتیں کریں تو حرف ''س'' کی ردیف میں ظفرؔ رانی پوری کی غزلیں خاص طور سے متوجہ کر گئیں۔ ظفرؔ رانی پوری کے یہاں ''لباس'' متنوع اضافتی ترکیبوں کے ساتھ آیا ہے جو خاص لطف دے رہا ہے۔ اسی طرح ''روپ'' اور ''ہونٹ'' یعنی ''پ'' اور ''ٹ'' کی ردیف میں شاذیؔہ نیازی کی غزلیں بھی مرکز توجہ بنیں۔ مختار عالم اعظمی کی دوسری غزل کا سوالیہ انداز اور ڈاکٹر اوپناش امنؔ کی دوسری

غزل کے کئی شعر میں روانی اور زور بیان بہرحال دیدنی ہے۔ مرزا رضوان بیگ کی غزل کا یہ شعر۔

یوں ترا بزم سے روٹھ کے جانا جاناں
ہم نے دل تھام لیا خود کو بچانے کے لئے

حسن تجنیس کے ساتھ احساس کو مشاہدے اور تجربے تک لا رہا ہے تو زویا شاہین صاحبہ کا یہ تلمیحی شعر بھی ایک اٹل سچائی دکھا رہا ہے۔

پیش باطل کٹ تو سکتے ہیں مگر جھکتے نہیں
زندگی کے سامنے یہ اسوۂ شبیر ہے

اسی طرح ڈاکٹر مقصود عالم رفعت کا شعر۔

جب معزز ہوں بے وفا پھر کیوں
اپنا وعدہ وفا کرے کوئی

اور سمیع احمد ثمر کا یہ شعر بھی خوب ہے۔

موت کا ڈر نہیں کسی کو بھی
فکر ہے سب کو زندگانی کی

شمع کوثر شمع صاحبہ نے بھی یہ طنزیہ شعر خوب کہا ہے۔

استاد کی غزل پہ تو اترار ہے ہو تم
کب تک لئے پھروگے اجالے ادھار کے

اور محمد فاروق گیاوی کی اس بات میں بھی ذرّہ برابر شک کی جگہ نہیں کہ معاشرے میں تعلیم کا فروغ ہو اور نااتفاقی ختم ہوجائے تو واقعی اس نیک کام اور نیک رجحان سے بہت کچھ بدلاؤ آسکتا ہے۔

تعلیم یافتہ سبھی ، حق میں سماج کے
گر متحد ہو جائیں تو پھر اچھا کام ہو

اس شمارے میں کتابوں پر تبصرے بھی وقیع ہیں، خاص طور سے بینش فردوس صاحبہ نے نتن جی کے مجموعہ ''افکار'' پر بڑی محنت سے لکھا ہے۔ جناب شبر امام کی وفات پر آپ نے جو تعزیتی مضمون رسالہ میں دیا ہے وہ خاصا معلوماتی بھی ہے۔ مرحوم بلاشبہ قلم سے ادبی تحقیق وتنقید اور مذہبی اور اخلاقی تبلیغ کا ہنر خوب جانتے تھے۔ اس اشاعت میں ''بچوں کا زبان وادب'' بھی ان کے ذوق سے ہم آہنگ ہے۔

ایم۔ عالم محفوظ، کولکاتا

کتابوں کی دنیا (ص ٦٦ سے آگے)

ارمغان ساحل مین اسٹریم کے افسانوں کی طرح روح عصر، معاشرتی مسائل اور کرداروں کی نفسیات کے اندروں میں گہرے نہیں اترتے، لیکن ان کے افسانے قصے کی دلچسپی، ماجرا سازی، کردار سازی اور واقعات کے بیان میں جزئیات نگاری وغیرہ کے اوصاف سے مزین ضرور ہیں اور یہ کہانی پن کا ساتھ بھی کبھی نہیں چھوڑتے۔

ان کے افسانوں میں ''صبح کا بھولا''، ''سپنوں کا شیش محل''، ''رشتے کی ڈور''، ''ساتواں آسمان'' وغیرہ کا شمار اچھے افسانوں میں کیا جاسکتا ہے اور انہیں دلچسپی سے پڑھا جاسکتا ہے۔ ''سراب'' دو کرداوں کے مکالموں پر مبنی افسانہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ ''مکالمہ'' بھی کہلا سکتا ہے، لیکن ایسا نہیں، اس لئے کہ بہرحال یہ کہانویت سے محروم نہیں ہے اور اس کا کلائمکس بھی بہت خوبصورت ہے جس میں بہرحال ''سراب'' کا دھوکہ نہیں بلکہ ہر لحاظ سے ''حقیقت'' کا جلوہ ہی جلوہ ہے۔

خوبصورت سرورق، عمدہ نفیس طباعت اور کم قیمت کے لحاظ سے یہ مجموعہ لائق مطالعہ ہے۔ ❁❁

یومِ آزادی کے موقع پر اکادمی میں پرچم کشائی

پٹنہ: حسب روایت یومِ آزادی کے پرمسرت موقع پر بہار اردو اکادمی کے احاطہ میں، سکریٹری بہار اردو اکادمی کے دست مبارک سے پرچم کشائی کی رسم ادا ہوئی۔ اس مبارک موقع پر اکادمی کے عملے اور دیگر حضرات نے شرکت کی۔

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کردیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا

زبان وادب

☆	یارب......	محسن رضا رضوی	۷۴
☆	ہمارے محمد	حیات بن عظمت	۷۴
☆	پیارے نبی کا بچپن	محمد میکائیل قاسمی	۷۵
☆	سائنسداں پروفیسر عبدالسلام	ڈاکٹر محمد زاہد	۷۶
☆	بجلی کی چمک، بادل کی گرج	نوازش خرم	۷۷
☆	جانِ وطن ہے اردو......	ابونصر فاروق صارم	۷۹
☆	اچھے چال چلن کی برکت	سید تنویر احمد	۸۰

محسن رضا رضوؔی

......یارب

مری دعا ہو قبول یارب — بحق آلِ رسول یارب
ترے خلائق میں سے کسی کا — نہ دل ہو ہرگز ملول یارب
تمام جن و بشر پہ تیرے — ہو رحمتوں کا نزول یارب
یہ کہکشاں ، چاند ، یہ ستارے — ہوں میرے قدموں کی دھول یارب
میں دشمنوں کے بھی راستے میں — بچھاؤں خوشیوں کے پھول یارب
چلوں اُسی راہ پر ہمیشہ — دکھا گئے جو رسول یارب
جیوں تو حق پر ، مروں تو حق پر — یہی ہو اپنا اصول یارب
ہماری اس زندگی کا مقصد — ہو دین حق کا حصول یارب
دعائے رضوؔیِ کمتریں کو — ملے مقامِ قبول یارب

❁❁❁

(ماخوذاز "فن ہمارا" مطبوعہ ۱۹۹۰ء، ص۱۵ و ص ۱۶)

حیاؔت بن عظمت

ہمارے محمد

وہ دنیا میں آئے بہاریں لٹانے — گلستانِ عالم کی زینت بڑھانے
وہ آئے ، وہ آئے ، ہمارے محمد
امیری غریبی کا جھگڑا مٹانے — غریبوں کی دنیا کو جنت بنانے
وہ آئے ، وہ آئے ، ہمارے محمد
بد اخلاق لوگوں کو انساں بنانے — بری خصلتوں سے دلوں کو چھڑانے
وہ آئے ، وہ آئے ، ہمارے محمد
گناہوں کی ظلمت میں شمعیں جلانے — بدی کی چٹانیں جہاں سے اُڑانے
وہ آئے ، وہ آئے ، ہمارے محمد

❁❁❁

(ماخوذاز ماہنامہ "آئینہ" لاہور، مئی ۱۹۶۰ء، ص۲۹)

محمد میکائیل قاسمی

Faculty of Arabi Lamguage,Govt. M.I. Shamsul Huda, Patna-800006 (Mob.9760277782)

پیارے نبی کا بچپن

عزیز بچو! انسان کی زندگی قدرتی طور پر تین ادوار میں بٹی ہوئی ہے، یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا میں جو حیات ظاہری گزارا، اس میں آپ کو عمر کے تینوں پن ملے اور دنیا جانتی ہے کہ آپ کی حیات طیبہ کے ایک ایک لمحہ کی تفصیل سیرت کی کتابوں نے محفوظ رکھا ہے، تاکہ اس کی روشنی میں ہم اپنی دنیا اور آخرت سنوارتے رہیں۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ''واقعہ فیل'' یعنی ابرہہ کے حملے کے پچاس دن بعد ۱۲/ربیع الاول مطابق ۱۷جون ۵۶۹ء بروز دوشنبہ عبدالمطلب کے گھرانے میں مکہ معظّمہ میں ہوئی۔ آپ کا نام محمد اور احمد رکھا گیا، دونوں کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ آپ کی پیدائش کے بعد چند روز آپ کی والدہ محترمہ نے، پھر ثوبیہ نامی ایک خاتون نے آپ کو دودھ پلایا۔

اس کے بعد اُس زمانے میں شرفا کے گھرانے کی رسم کے مطابق دودھ پلانے کے لئے آپ کو حضرت حلیمہ سعدیہ کے سپرد کیا گیا جو قبیلہ ہوازن کی تھیں اور ان کی شیما نامی ایک بیٹی بھی تھی۔ آپ کے بچپن کا چھ سال ان کے یہاں گزرا۔ آپ کی دودھ شریک بہن کے علاوہ چار دودھ شریک بھائی بھی تھے اور آپ اپنی نیک عادتوں کی وجہ سے اُن سب کے چہیتے تھے اور حضرت حلیمہ بھی آپ کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔

آپ کے والد گرامی کا نام عبداللہ اور آپ کے دادا کا نام عبدالمطلب ہے اور آپ کی والدہ کا نام حضرت آمنہ۔ آپ کے والد کا انتقال آپ کی ولادت سے دو ماہ پہلے ہی ہو گیا تھا۔ وہ شادی کے بعد ملک شام کے تجارتی سفر سے لوٹ رہے تھے کہ یثرب کے مقام پر ان کی طبیعت بگڑی اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا اور اس طرح آپ کی پرورش کی ذمہ داری آپ کے دادا کے سر آ گئی، جسے انہوں نے بہت اچھی طرح پورا کیا۔

جب آپ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو آپ کی والدہ آپ کو لے کر یثرب کے سفر پر نکلیں تاکہ آپ کو آپ کے والد کے ننیہالی لوگوں سے ملائیں، اس سفر میں ام ایمن بھی ساتھ تھیں، جنہوں نے شروع دن سے ہی آپ کی دیکھ بھال کا ذمہ لے رکھا تھا اور آپ ان سے بہت ہی مانوس تھے، مگر اللہ کی مرضی! آپ کی والدہ کا اس سفر سے واپسی میں ''ابوا'' کے مقام پر انتقال ہو گیا۔ یہ بڑا حادثہ تھا۔ اُس وقت ام ایمن نے آپ کو سنبھالا، دلاسا دیا اور مکہ مکرمہ لائیں اور آپ کے دادا عبدالمطلب کے حوالے کر دیا، دادا جان نے اپنے پوتے کی بہت اچھی پرورش کی اور محبت و پیار کے پھول نچھاور کئے۔ آپ ابھی ۸ سال کے تھے کہ آپ کے دادا بھی چل بسے، اس کے بعد آپ کے چچا ابو طالب نے آپ کی پرورش کی۔ آپ نے ان کے ساتھ شام کا سفر بارہ سال کی عمر میں کیا تھا۔

رسول پاک کی ابتدائی زندگی کا ایک خاص واقعہ وہ بھی ہے جو ''حلف الفضول'' کہلاتا ہے۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ یمن کے قبیلہ کا ایک آدمی سامان تجارت لے کر مکہ آیا جسے عاص بن وائل نے خریدا اور اس کی قیمت ادا کرنے سے انکار کرنے لگا تو یہ معاہدہ ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کے لئے ہوا جس میں رسول اکرم نے شرکت فرمائی تھی اور اس پر غایت درجہ خوش ہوئے تھے۔

پیارے بچو! آپ نے دیکھا کہ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن کیسا تھا۔ آپ اپنی پیاری امی جان اور ابو جان سے زمانہ طفلی میں محروم ہو گئے تھے، لیکن آپ نے اس محرومی کو کبھی، کسی کام میں آڑے نہیں آنے دیا، یہاں تک کہ جب بچپن رخصت ہونے لگا، اس وقت بھی حالات کے مطابق آپ نے ظالم کے خلاف مظلوم اور غریب انسان کی مدد کے لئے حلف الفضول نامی عہد نامہ میں شرکت کی۔

❁❁❁

ڈاکٹر محمد زاہد
B-5, Garden Reach, Kolkata-700024 (Mob. 8697194075)

سائنسداں پروفیسر عبدالسلام

پیارے بچو! تم نے ماضی کے مشہور مسلم سائنسداں ابونصر فارابی، ابن سینا، ابن رشد، عمر خیام، محمد ابن موسیٰ وغیرہ کے نام ضرور سنے ہوں گے جنہوں نے علم ریاضی، علم کیمیا، علم افلاک وغیرہ کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار انجام دیے۔ ان کی لکھی عربی زبان میں کتابیں بعد میں یورپ والوں تک پہنچیں جنہوں نے ان سے فیض اٹھایا اور بہت سی ایجادات کیں، آج ہم تمہیں بیسویں صدی کے ایک مسلم سائنسداں پروفیسر عبدالسلام کے بارے میں بتاتے ہیں۔

محمد عبدالسلام کی پیدائش ۲۹ جنوری ۱۹۲۶ء کو متحدہ ہندوستان کے چھوٹے سے علاقہ جھنگ میں ہوئی تھی۔ ان کے والد چودھری محمد حسین ایک اعلیٰ آفیسر تھے اور ان کی ماں کا نام ہاجرہ حسین تھا۔ انہوں نے عبدالسلام کو اچھے اسکولوں میں تعلیم دلوائی۔ سائنس خصوصاً علم طبیعات سے عبدالسلام کو خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ایس سی اور لاہور یونیورسیٹی سے ایم ایس سی کیا اور پھر وظیفہ پا کر فزکس اور علم ریاضی میں کیمرج کے سینٹ جان کالج سے مزید تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں انہوں نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ کیمرج، انگلینڈ میں رہتے ہوئے انہیں "Smith Prize" برائے فزکس ملا جس نے ان کی شہرت میں اضافہ کر دیا۔

ڈاکٹر عبدالسلام جب وطن واپس آئے تو ملک کا بٹوارہ ہو چکا تھا اور پاکستان بن چکا تھا۔ انہوں نے صدر شعبہ ریاضی، پنجاب یونیورسیٹی کا عہدہ سنبھالا۔ انہیں ریسرچ کی لگن تھی، لیکن ماحول سازگار نہ تھا، چنانچہ حالات سے تنگ آ کر کئی برسوں بعد وہ انگلینڈ واپس چلے گئے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ سینٹ جان

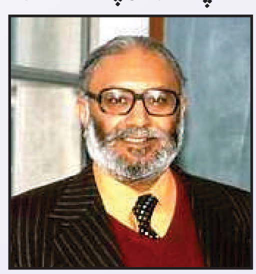

کالج میں لکچرر مقرر ہوئے اور ۱۹۵۷ء میں امپیریل کالج کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور وہیں سے انہوں نے اپنے مشہور زمانہ ریسرچ کے اُس کام کا آغاز کیا جس نے Electro Magnetic اور Nuclear Force کے درمیان Hypothetical Equation دکھانے کا راستہ فزکس کے سائنس دانوں کے سامنے پیش کیا، اس تھیوری کو ۱۹۷۹ء میں نوبل انعام کا مستحق سمجھا گیا اور پروفیسر عبدالسلام کو امریکی ماہر طبیعات Sheldon Glashow اور Steven Weinberg کے ساتھ نوبل انعام برائے فزکس سے نوازا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں پروفیسر عبدالسلام نے دیگر افراد کے ساتھ مل کر اٹلی کے شہر Trieste میں "International Centre For Theoretical Physics" نامی ادارہ کی بنیاد ڈالی جس نے دنیا بھر کے سائنس ریسرچ اسکالرز کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ خصوصاً فزکس سے دلچسپی رکھنے والے سائنسداں اور طالب علم جو ترقی پذیر ممالک سے تعلق رکھتے تھے، ان کو آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا۔ سلام صاحب اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور تا عمر اس عہدے پر برقرار رہے۔

پروفیسر عبدالسلام اور ان کے دو ساتھیوں کا یہ اہم کام "Electro Weak Theory" کے نام سے سائنسی دنیا میں مشہور ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں انہیں Copley Medal سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۴ء میں Hughes Medal ۱۹۷۸ء میں Royal Medal وغیرہ سے سرفراز کیا گیا۔ پروفیسر عبدالسلام کا انتقال ۲۱ نومبر ۱۹۹۶ء کو ہوا۔ ان کی یاد میں حکومت پاکستان نے عبدالسلام ایوارڈ کا آغاز ۱۹۸۱ء سے کیا۔ اب تک یہ ایوارڈ کئی خوش نصیبوں کو مل چکا ہے، جن میں ڈاکٹر ناظمہ اکرام، ڈاکٹر پرویز امیر علی اور ڈاکٹر مجاہد کامران شامل ہیں۔

نوازش خرم
Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

بجلی کی چمک، بادل کی گرج

پیارے بچو! یہ برسات کا زمانہ ہے اور اس موسم میں آسمانی بجلی گرنے سے جانی اور مالی نقصانات کی خبریں آئے دن اخباروں میں پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ اشتہاروں کے ذریعہ اس سے ہوشیار رہنے اور حفاظتی تدبیریں اپنانے کے بارے میں بھی بار بار دھیان دلایا جاتا ہے تا کہ اس ناگہانی آفت سے جہاں تک ہو سکے، بچا جا سکے۔ مذہبی کتابوں میں جو کچھ بتایا گیا ہے، اس کے لحاظ سے آسمانی بجلی کا گرنا اللہ کا قہر اور قدرتی آفت کی ایک شکل ہے، جس سے بچائے رکھنے کی دعا کرنی چاہیے۔ زلزلہ، سیلاب، قحط، آتش زنی بادلوں کا پھٹنا اور رعد و برق یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں جو زمین پر بسنے والوں اور برائی کے راستے اپنا لینے والوں کو عبرت دلاتی ہیں اور بیشک اللہ ہی ہر طرح کی آفتوں سے محفوظ رکھنے والا ہے۔

عزیز بچو! اب آؤ اس موضوع کے ایک دوسرے رُخ یعنی سائنسی رُخ کی طرف، جسے فزکس میں ''فضا میں بجلی کے واقعات'' جیسا کوئی عنوان دے کر پڑھایا جاتا ہے۔ برسات کے دنوں میں بادل گرجتا ہے اور بجلی چمکتی ہے، یہ بات تو آج نہیں بلکہ سینکڑوں ہزاروں برس سے انسان سنتا اور جانتا ہی نہیں بلکہ دیکھتا بھی چلا آ رہا ہے، لیکن رعد و برق یعنی بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے واقعات کی فطرت کیا ہے؟ اس سوال کے جواب سے پچھلے زمانے کے لوگ یا یوں کہیں کہ آج سے دو سو سال پہلے تک کے لوگ قطعاً ناواقف تھے۔ یہ تو روس اور امریکہ کے سائنسدانوں کا احسان ہے کہ اُن کی محنت، غور و فکر اور اُن کے وسیع ریسرچ سے اس سوال کا سائنسی جواب ہمارے سامنے آیا۔ روسی سائنسداں کا نام ایم۔ لومونوسوو ہے اور امریکی سائنسداں کا نام بی۔ فرینکلن۔ ان دونوں کی سائنسی تحقیقات سے ہی اٹھارہویں صدی عیسوی میں دنیا کو یہ معلوم ہوا کہ بجلی بہت بڑی چنگاری کے کرۂ ہوا میں اخراج کا نام ہے۔

انہوں نے اپنی تحقیقات میں جو کچھ بتایا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بادلوں کی گرج سے پہلے ان پر کافی بڑی مقدار میں برقی چارج جمع رہتا ہے اور زمین سے کافی اونچائی پر ہونے کی وجہ سے یہ عمل بہت ہی آسان ہو جاتا ہے، اس لئے کہ بادلوں پر جمع چارج زمین میں نہیں جا سکتا۔

فضا میں بجلی کے واقعات کی بابت سائنسدانوں نے بتایا ہے کہ جب مخالف چارجوں والے بادل ایک دوسرے سے قریب آتے ہیں، تب اُن کے بیچ ایک طاقتور ''برقی میدان'' (Electric Field) پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے منفی چارج شدہ بادلوں کے الکٹران ہوا سے ہو کر مثبت چارج شدہ بادلوں کی طرف جانے لگتے ہیں۔ اس ''برقی رو'' کی وجہ سے ہوا گرم ہو جاتی ہے اور نسبتاً ''برقی چالک'' بھی۔ اس طرح ایسے دو بادلوں کے درمیان بجلی کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ بادلوں میں جمع چارج ہوا کے ذریعہ گزر جاتے ہیں۔ یہ برقی اخراج ایک سکنڈ کے کچھ حصہ کے اندر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اسی کو ادب و شاعری کی زبان میں ''بجلی کا کوندا سا لپک جانا'' کہا جاتا ہے۔

ہوا کی گرم پرتوں کے تیزی اور طاقت کے ساتھ پھیلنے کی وجہ سے جو آواز پیدا ہوتی ہے، وہی ہمیں گرج کی شکل میں سنائی دیتی ہے۔

دو چارج شدہ بادلوں کے درمیان چمک

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ فضا میں چمک اور گرج ایک ساتھ ہوتے ہیں، مگر ہمیں چمک دکھائی دینے کے بعد ہی گرج سنائی دیتی ہے یعنی پہلے بجلی چمکتی ہے تب بادل بولتا ہے۔ اس کی سائنسی وجہ یہ ہے کہ ہوا میں آواز کی رفتار ۳۴۰ میٹر فی سکنڈ اور روشنی کی رفتار ۳۰۰،۰۰۰ کلومیٹر فی سکنڈ ہے۔

پوچھا جاسکتا ہے کہ بادلوں میں گڑگڑاہٹ کیوں ہوتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ چمک کے مختلف حصوں سے آواز کی لہریں ایک ساتھ زمین پر نہیں پہنچتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ بادلوں اور زمین پر ہر چیز سے آواز کا انعکاس ہوتا ہے، اس لئے آواز دیر تک سنائی دیتی رہتی ہے۔

یہ بات بھی خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ برقی اخراج صرف دو بادلوں کے درمیان ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی چارج شدہ اور زمین کے بیچ بھی ہوتا ہے اور تب آسمانی بجلی گرتی ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب منفی چارج شدہ بادل زمین کے نزدیک آجاتا ہے، تب اس کے ذریعہ زمین پر مثبت چارج بذریعہ تحریک پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بادل اور زمین کے درمیان برقی اخراج ہوجاتا ہے اور چمک پیدا ہوتی ہے۔ بجلی کی یہ چمک سیدھی لائن میں کئی میٹر تک لمبی ہوتی ہے۔ اسی کا نام عام زبان میں آسمان سے بجلی گرنا ہے۔

یہ آسمانی بجلی کسی بھی پیڑ کو چشم زدن میں یعنی پلک جھپکتے

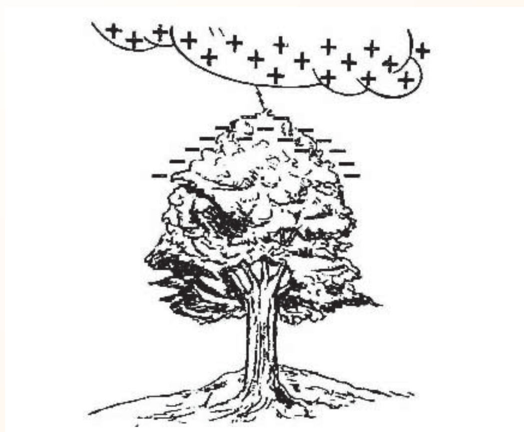

چارج شدہ بادل اور زمین کے بیچ چمک کی نوعیت

برباد کرسکتی ہے۔ اگر کسی عمارت سے ٹکرائے تو اس کو جلا کر بھسم کرسکتی ہے اور کھیت کھلیان ہو تو اس کو بھی جلا کر خاکستر کرسکتی ہے۔ بجلی گرنے کی جگہ پر اگر کوئی آدمی یا مویشی ہو یا کوئی سامان ہو تو وہ بھی جل کر راکھ ہوجاتا ہے، غرض کہ اس آسمانی بجلی کی زد میں جو چیز آتی ہے، ختم ہوجاتی ہے، بھسم ہوجاتی ہے، اسی لئے جب موسم خراب ہو، زور زور سے بجلی چمک رہی ہو اور بادل گرج رہے ہوں تو کھلی جگہ میں رہنے اور خاص طور سے پیڑ یا کسی ٹاور کے پاس پناہ لینے سے منع کیا جاتا ہے، کیوں کہ خراب موسم میں ایسی جگہوں پر بجلی گرنے کا خطرہ زیادہ رہتا ہے۔

بجلی سے حفاظت کے لئے، مکانوں اور دوسری عمارتوں میں ایک چھڑ لگایا جاتا ہے جس کو ''کوندھا چالک'' (Lightning Conductor) کہتے ہیں۔ اس چھڑ کا اوپری سرا ترشول جیسا ہوتا ہے اور نچلا سرا زمین کے اندر کافی گہرائی میں ایک دھات کی پلیٹ سے جڑا ہوتا ہے۔ جب بجلی کوندھا چالک سے ٹکراتی ہے، تب مکمل چارج اس چالک کے ذریعہ زمین کے اندر چلا جاتا ہے اور عمارت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے۔ یہ دھات کی چھڑ بہت ہوشیاری اور احتیاط سے لگائی جاتی ہے اور اس سے دو فائدہ ہوتا ہے، ایک یہ کہ بجلی کو اپنے میں سے گزرنے کے لئے یہ آسان راستہ پیدا کردیتی ہے اور دوسرے یہ کہ چارج شدہ بادلوں کے

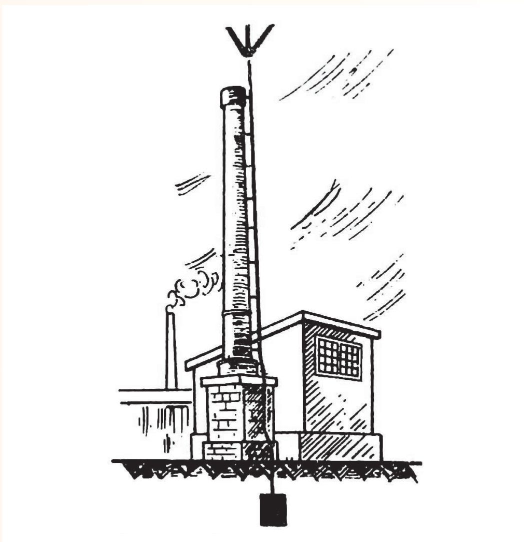

کارخانے کی چمنی میں لگا ہوا کوندھا چالک

ذریعہ، عمارت پر بذریعہ تحریک پیدا ہوئے چارجوں کے اخراج میں یہ معاون و مددگار بھی بنتی ہے۔ (تصاویر اور بنیادی سائنسی نکات کے لئے، درسی کتاب ''طبیعات'' شائع کردہ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۷۴ء کے تیسرے حصہ سے خصوصی اخذ واستفادہ)

ابونصر فاروق صارمؔ
Khajoor Banna, Pathar ki Masjid, Patna - 800006 (Mob. 8298104514)

جانِ وطن ہے اردو، شانِ وطن ہے اردو

ہندوستاں میں اردو اک ایسی انجمن ہے
جس میں ہر ایک فرقہ بھائی ہے اور بہن ہے
اس میکدے سے پی کر سرشار جو بھی نکلا
وہ فخر انجمن ہے اور نازش وطن ہے

اُردو کی انجمن میں جو باکمال آیا
قوس قزح کے جیسا وہ آسماں پہ چھایا
مذہب کے خرخشے سے اس کو نہیں ہے مطلب
ہر اہل دل کو اس نے بڑھ کر گلے لگایا

اردو کی ہم نوائی پر ناز ہے اُسے بھی
اردو نے میر اردو جس کو بنا دیا ہے
دنیائے علم میں اک ایسی زباں ہے اردو
اک غیر کو بھی جس نے سر پر بٹھا لیا ہے

فرسودہ ہو گئی ہے ہر چیز اس جہاں کی
لیکن کمال یہ ہے اب بھی جواں ہے اردو
اس میں کشش ہے کتنی یہ بھی دکھا دیا ہے
عظمت کا سربلندی کا اک نشاں ہے اردو

امن اور آشتی کا دلکش چمن ہے اردو
تہذیب دلبری کی گنگ و جمن ہے اردو
مفتی نہیں ہیں لیکن صارمؔ کا ہے یہ فتویٰ
جانِ وطن ہے اردو ، شانِ وطن ہے اردو

تین رباعیاں

ہو نکہت گل تو اُس کو خوشبو کہئے
صورت ہو اگر پری تو خوش رو کہئے
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا صاحب
اُردو ہے ، مبارکؔ اُس کو اُردو کہئے
(مبارکؔ عظیم آبادی)

کی جائے جو دِل سے وہ عبادت اچھی
محنت سے جو حاصل ہو وہ دولت اچھی
اک دل بھی ہو قبضہ تو حاصل زیست
ہو جبر نہ جس میں وہ سکونت اچھی
(بدیع الزماں قمرؔ)

دشوار ہے انسان کا انساں ہونا
ہاں سہل نہیں صاحب عرفاں ہونا
پھر بھی ثمرؔ انسان جو آمادہ ہو
مشکل نہیں مشکل کا بھی آساں ہونا
(ثمرؔ لاہوری)

سید تنویر احمد
Chhoti Kachari, Vill+P.o.Neora, Patna-801113 (Mob. 7488225973)

اچھے چال چلن کی برکت

پیارے بچو! ایک حکیم کا قول ہے کہ ''انسان کی پہچان اُس کے چال چلن سے ہے۔'' اگر کسی آدمی کا چال چلن اچھا نہ ہوتو اُسے کوئی بھلا آدمی نہیں کہتا جب کہ اُس آدمی کی سماج میں ہر جگہ عزت اور قدر ہوتی ہے جس کی عادتیں اچھی ہوں۔ بیشک نیک اطوار ہونا انسان کی ایک زریں صفت ہے اِسی کو ''نیک چلنی'' بھی کہتے ہیں جو اصل میں بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ اردو میں دولفظ اکثر بولا جاتا ہے۔ ''سگھڑ'' اور ''پھوہڑ'' یعنی نیک چلن، نیک مزاج، ہر کام کو سلیقہ سے انجام دینے والا، باادب اور شریف یا اُس کے برعکس بدچلن، بدذات، بدمعاش، کسی کام کو ڈھنگ اور قاعدے سے انجام نہیں دینے والا، بے ادب، بدتمیز۔

یہاں مرد یا عورت اور بچے یا بڑے کی کوئی قید نہیں ہے، جس کا مزاج، جس کی عادت یا جس کا چال چلن جیسا ہوتا ہے، دنیا اسے ویسا ہی کہتی ہے۔ لڑکا ہو یا لڑکی، اگر وہ بڑوں کے ساتھ ادب واحترام اور اخلاق سے پیش آئے، چھوٹوں سے شفقت ومحبت رکھے، لالچ میں نہ پڑے، ہمدردی ورحم دلی سے کام لے، آپس میں میل جول رکھے، بے شرمی اور خودغرضی سے ہمیشہ دور رہے اور سادگی اور ایمانداری سے زندگی گزارے تو وہ یقیناً نیک چلن اور شریف کہلانے کا حق دار ہے۔ نیک چلن بننے کے لئے اخلاق وعادات کا درست ہونا پہلی شرط ہے اور یہ بھی سمجھی بوجھی ہوئی بات ہے کہ اخلاقی اور مذہبی تعلیم وتربیت کے بغیر یہ شرط ہرگز پوری نہیں ہوسکتی ہے۔

یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی مذہب اور اخلاق سے دور رہ کر دولت مند بن جائے یا کوئی اونچا عہدہ پالے، اُسے نام وشہرت اور آرام وآسائش مل جائے، لیکن یہ بہت مشکل ہے اور بہت ہی ناقابل یقین کہ وہ نیک اطوار بن سکے، اس لئے کہ اخلاقی اور دینی سمجھ بوجھ کے بغیر جو ظاہری اور دنیاوی ترقی ملتی ہے وہ آدمی کو تباہی وبربادی کی طرف لے جاتی ہے، مذہب واخلاق سے بیگانہ شخص انسانیت، بھائی چارگی اور رواداری جیسی صفات سے کوسوں دور ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو بھول جاتا ہے، اپنی ظاہری ترقی کے گھمنڈ سے ہر وقت چور رہتا ہے، اُسے نہ تو اچھے کاموں کا خیال رہتا ہے نہ ہی برے کاموں کے انجام کا خوف۔ اس طرح اس کی زندگی بے لگام ہوجاتی ہے، اس کی عادتوں اور طور طریقوں کی وجہ سے ماحول خراب ہوتا ہے، سماج بگڑنے لگتا ہے اور نیک چلن بننا تو دور کی بات رہی، نیک چلن لوگوں کے لئے اس کی وجہ سے جینا بھی دوبھر ہوجاتا ہے۔ اس کی دولت، اس کے اندر تکبر لا دیتی ہے اور اس کے اردگرد عیش وآرام کے جو بے شمار سامان ہوتے ہیں، وہ اسی کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔ یہی حال اپنے علم اور اپنی عقل پر گھمنڈ کا بھی ہوا کرتا ہے کہ ایسا آدمی اپنے آپ کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے، طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا ہوجاتا ہے اور کسی کی کوئی اچھی بات سننا کبھی گوارا نہیں کرتا ہے۔

پیارے بچو! ابھی آپ کی کم سنی کا زمانہ ہے اور یہی وہ وقت ہے کہ آپ تھوڑا سا دھیان دیں تو آپ نیک چلن بن سکتے ہیں اور آپ کے ساتھیوں کو بھی نیک چلنی کی وہ دولت مل سکتی ہے جو عمر بھر کام آنے والی ہے۔ نیک چلن اور تمیزدار بننا صرف لڑکوں کی نہیں لڑکیوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ سگھڑاپا اپنائیں اور پھوہڑپن سے بچیں۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی حضرت فاطمہ سے فرمایا کرتے تھے کہ بیٹی! تم خود اچھی بنو، اچھے کام کرو، قیامت میں تم کو محمد کی بیٹی ہونا کام نہ آئے گا۔ نبی پاک کی یہ نصیحت گویا زندگی کا زریں اصول ہے۔ اسی کا نام سگھڑپن اور نیک چلنی ہے جس سے آدمی کو بلندی، نیک نامی اور عزت ومرتبہ ملتا ہے اور اسی سے قومی عزت بھی بڑھتی ہے۔

رباعیات

ناؔدم بلخی

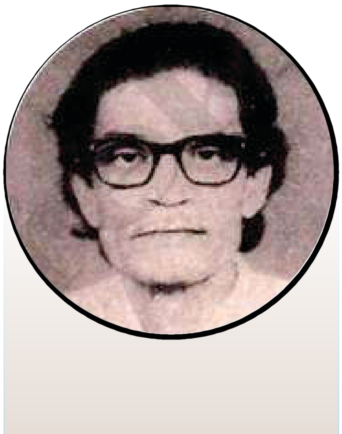

احساس شرافت یہ مٹا دیتی ہے
جذباتِ رفاقت کو ہوا دیتی ہے
سب سے ہے بری فرقہ پرستی کی ہوا
انسان کو خوں خوار بنا دیتی ہے

ہر پھول کھلا بادِ بہاری سے ہے
گلشن کا وجود آبیاری سے ہے
سمجھے اسے کوئی کہ نہ سمجھے لیکن
خاکی کا مقام خاکساری سے ہے

ہستی کو بلندی ہی کی ہستی رکھو
اس کو نہ کبھی جانب پستی رکھو
انسان بگڑتا ہے اَنا کے ہاتھوں
ہرگز نہ خیال خود پرستی رکھو

تخریب سے انساں کو بچاتا ہے ادب
تعمیر ہے کیا چیز بتاتا ہے ادب
اخلاق کی محفل میں بٹھا کر اس کو
تہذیب کا ہر درس پڑھاتا ہے ادب

رہبر ہے قلمکار تو راہی ہے قلم
راقم کا وفا دار سپاہی ہے قلم
سنجیدہ روی اس کی ہے لازم ورنہ
بہکا تو سمجھ ، وجہ تباہی ہے قلم

ناؔدم بلخی کا اصل نام سید محمد ابراہیم بلخی ہے، لیکن وہ اپنے تخلص اور قلمی نام سے ہی جہانِ شعروادب میں متعارف ہیں۔ ناؔدم بلخی کا آبائی وطن پٹنہ ہے اور اُن کے والد گرامی کا نام سید فصیح الدین بلخی۔ ناؔدم بلخی نے حصول تعلیم کے بعد، جی ڈی اے کالج، ڈالٹین گنج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دئے اور ساتھ ہی ساتھ نثری و شعری تصانیف سے بھی علمی دنیا کو نوازتے رہے۔ ان کے بارہ شعری مجموعے اشاعت یافتہ ہیں، جن میں پہلے مجموعہ ''آغازِ سحر'' مطبوعہ ۱۹۶۱ء کے علاوہ ''چودہ طبق''، ''ضیائے عرفان''، ''ذوق سفر'' وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ''شعاعِ نقد'' کے نام سے اُن کے تحقیقی وتنقیدی مقالوں کا مجموعہ بھی اشاعت یافتہ ہے۔ وہ محض شاعر نہیں بلکہ ماہر عروضیات بھی تھے، جس کا ثبوت ان کی کتاب ''تفہیم العروض'' سے ملتا ہے۔ ناؔدم بلخی نے نہ صرف غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں بلکہ آزاد غزل، سانیٹ، دوہے اور قطعات جیسی اصناف شاعری میں بھی کامیاب طبع آزمائی کی۔ ''نقطوں کا حصار''، ''تحفے''، ''دوپہر کا دائرہ''، ''میٹھی میٹھی بولیاں''، ''باطنی ارتعاش''، ''دھوپ میں صحرانوردی'' اور ''آؤ بچو! یہ پہلی بوجھیں'' وغیرہ بھی ان کی یادگار کتابیں ہیں۔ ناؔدم بلخی کی ولادت ۱۶ ستمبر ۱۹۲۶ء کو ہوئی اور طویل عمر پاکر ۱۸ ستمبر ۲۰۰۶ء میں وہ اِس دارِفانی سے رخصت ہوئے۔

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 45 | **September - 2024** | **No. 09**

یومِ آزادی کے موقع پر پرچم کشائی ایک منظر

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں
طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy,
on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press
Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

Rs. 15